تلمیحاتِ غالب

محمود نیازی

غالب اکیڈمی، نظام الدین، نئی دہلی

(S.Z.H. Naqvi)
18-1-1980
Secretary,
GHALIB ACADEMY
Hzt NIZAMUDDIN
DELHI-110013.

تلمیحاتِ غالبؔ

مولفہ

محمود نیازی

غالب اکیڈمی، نظام الدین، نئی دہلی

MASOOD FAISAL JHANDIR LIBRARY
Acc No. 045050
★ MAILSI ★

غالب اکیڈمی ، نئی دہلی

TECHNICAL SUPPORT BY
CHUGHTAI
PUBLIC LIBRARY

اشاعت : جون ۱۹۷۲ء

تعداد : ایک ہزار

ناشر : غالب اکیڈمی، نظام الدین، نئی دہلی ۱۳

قیمت : چھ روپے

جمال پرنٹنگ پریس، دہلی ۶

"میں اپنی اس ناچیز تالیف کو
برادرِ محترم جناب ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی
صدر شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی کے اسم گرامی پر
معنون کرتے میں مسرت محسوس کرتا ہوں جن کی
اعانت و رہنمائی سے یہ کام انجام پذیر ہوا ہے۔"

تعارف

از

حضرت مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشی رامپوری

دنیا کی کوئی چھوٹی بڑی زبان ایسی نہ ہوگی جس میں قصّہ طلب الفاظ بولے یا لکھے نہ جاتے ہوں۔ اہلِ عرب نے مذکورۂ بالا قسم کے الفاظ استعمال کرنے کو ادبی ہنر قرار دیا ہے، اور اس کو تلمیح کہتے ہیں۔ تلمیح کے لغوی معنی کسی چیز کی طرف اشارہ کرنا ہیں اور فنّی مطلب یہ ہوتا ہے کہ کلام میں اختصار کے ساتھ حسن یا زور پیدا کرنے کے لیے کسی قصّے، شعر یا کہاوت کی طرف اشارہ کیا جائے، مثلاً عربی کا شعر ہے:

فَوَاللهِ، مَا أَدْرِی، أَأَحْلَامُ نَائِمٍ
أَلَمَّتْ بِنَا، أَمْ كَانَ فِي الرَّكْبِ يُوْشَعُ

اس شعر سے پہلے شاعر نے کہا ہے کہ میں اپنے مسافر دوستوں سے جا ملا اور رات کے اندھیرے میں محبوبہ کا چہرہ سورج کی طرح میری آنکھوں میں جگمگا اٹھا۔ مگر قسمت کی اس یاوری پر شاعر کو یقین نہیں آتا، اور وہ اس حیرت و استعجاب کو ظاہر کرنے کے لیے آخر میں کہتا ہے کہ "بخدا، میں نہیں جانتا کہ یہ خوابِ پریشاں تھا، جو میں نے دیکھا، یا کاروان میں یوشع موجود تھے۔" اس شعر میں یوشع تلمیح ہے، اور اس میں ردِ شمس کے قصّے کی طرف اشارہ ہے جو

خداوند عالم نے سنیچر کی شام حضرت یوشع کی دعا پر لوٹا دیا تھا تاکہ وہ جہاد کی تکمیل کر سکیں، ورنہ اتوار شروع ہو جانے پر جنگ نہیں کی جا سکتی تھی۔

دیکھیے اس شعر میں لفظ یوشع نے ایک طویل قصّے کو دُہرانے سے بچا لیا، ایک اور عربی شعر ہے:

لَعَمْرٌو مَعَ الرَّمْضَاءِ وَالنَّارِ تَلْتَظِیْ
اَرَقُّ وَاَحْفٰی مِنْکَ فِی سَاعَۃِ الْکَرْبِ

یعنی عمرو تپتی زمین اور بھڑکتی آگ میں ہوتے ہوئے بھی دکھ کی گھڑی میں تجھ سے زیادہ نرم دل اور شفیق ثابت ہوگا۔ اس شعر میں شاعر نے ایک مشہور شعر کی طرف اشارہ کیا ہے، جو یہ ہے:

اَلْمُسْتَجِیْرُ بِعَمْرٍو عِنْدَ کُرْبَتِہٖ
کَالْمُسْتَجِیْرِ مِنَ الرَّمْضَاءِ بِالنَّارِ

یعنی جو کوئی اپنی مصیبت میں عمرو سے پناہ طلب کرے، وہ ایسا ہے جیسے کوئی شخص تپتی زمین سے بچنے کے لیے آگ سے پناہ مانگے۔

یہ آخری شعر بھی قصّہ طلب ہے۔ جساس بن مرہ اور عمرو بن حارث دونوں آگے پیچھے کلیب کو قتل کرنے نکلے۔ جساس نے کلیب کو جا لیا اور اسے تیر مار کر زخمی کر دیا۔ کلیب نے زمین پر تڑپتے ہوئے جساس سے پانی مانگا۔ جساس نے پانی نہ دیا اور چھوڑ کر چل دیا۔ اتنے میں عمرو آ گیا۔ کلیب نے اس سے بھی پانی مانگا۔ عمرو نے پانی کی جگہ آبِ شمشیر پیش کیا اور اس کا کام تمام کر دیا۔ کلیب نے مرتے وقت مذکورہ شعر کہا تھا، جو عرب میں مشہور ہو گیا۔

دیکھیے اس شعر میں "بعمرو" کہہ کر شاعر نے ایک قصّہ طلب شعر کے اعادے سے روک لیا۔

کلام مجید کی ایک آیت ہے: کمثل الحمار یحمل اسفارا۔ یعنی جیسے گدھے پر کتابیں لاد دی جائیں۔ اس آیت مبارکہ میں عربی کی ایک کہاوت کی طرف اشارہ ہے، جو ان الفاظ کے ساتھ مشہور ہے: اَجْھَلُ مِنْ حِمَارٍ وَاَبْلَدُ مِنْ عَیْرٍ یعنی فلاں شخص گدھے سے زیادہ نادان

اور اس سے بڑھ کر احمق ہے۔

دیکھیے، اس کہاوت کی طرف اشارے سے معنی میں کتنا حسن اور زور پیدا ہو گیا۔

فارسی اور اردو زبان میں بھی اسی طرح قصّے، شعر اور کہاوتیں تلمیحاً استعمال کی گئی ہیں۔

میرزا غالب فارسی اور اردو دونوں زبانوں کے بلند پایہ شاعر اور نثر نگار تھے۔ ان میں جدّت پسندی بہت تھی، نیز دماغ خلاقِ الفاظ و معانی پایا تھا، اسی بنا پر فارسی و اردو کی مشہور تلمیحوں کو انھوں نے نئے نئے انداز سے برتا اور اپنے مطالعہ کرنے والے کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ اُن تمام قصّوں سے آگاہ ہو، جن کی طرف اشعارِ غالب میں اشارے کیے گئے ہیں۔

مثلاً خضر کو لیجیے اور دیکھیے کہ اس ایک تلمیح سے غالب نے کیا کیا مطالب اور کیسے کیسے مضامین پیدا کیے ہیں، لکھتے ہیں۔

مشقی نقشِ قدم، نسخۂ آبِ حیواں
جادۂ دشتِ نجف، عمرِ خضر کا طومار

جہاں مٹ جائے سعیِ دیدِ خضرِ آبادِ آسائش
بجیبِ ہر نگہ پنہاں ہے حاصل رہنمائی کا

مجھے راہِ سخن میں خوفِ گمراہی نہیں غالبؔ
عصائے خضرِ صحرائے سخن ہے خامہ بیدل کا

بحسرت گاہِ نازِ کشتۂ جاں بخشیِ خوباں
خضر کو چشمۂ آبِ بقا سے تر جبیں پایا

سیر آں سوئے تماشا ہے طلب گاروں کا
خضر مشتاق ہے اس دشت کے آواروں کا

حیرتِ اندازِ رہبر ہے عناں گیر، اے اسد
نقشِ پائے خضر، یاں، سدِّ سکندر ہو گیا

کیجے آہوئے ختن کو خضرِ صحرائے طلب
مشک ہے سنبلستانِ زلف میں گردِ سواد

وحشتِ دردِ بیکسی، بے اثر اس قدر نہیں
رشتۂ عمرِ خضر کو نالہ نارسا سمجھ

اسد، جز آب بخشیدن ز دریا خضر کو کیا تھا
ڈبوتا چشمۂ حیواں میں گر کشتی سکندر کی

ممکن ہے، کرے خضر سکندر سے ترا ذکر
گر لب کو نہ دے چشمۂ حیواں سے طہارت

تو سکندر ہے، مرا فخر ہے ملنا تیرا
گو شرف خضر کی بھی، مجھ کو ملاقات سے ہے

یا لگا کر خضر نے شاخِ نبات
مدتوں تک دیا ہے آبِ حیات

حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز — دعا قبول ہو یا رب، کہ عمرِ خضر دراز

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر — نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں — جانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

کیا کیا خضر نے سکندر سے — اب کسے رہنما کرے کوئی

بے صرفہ ہی گزرتی ہے، ہو گرچہ عمرِ خضر — حضرت بھی کل کہیں گے کہ "ہم کیا کیا کیے"

مسلکِ شرع کے ہیں راہرو و راہ شناس — خضر بھی یاں، اگر آجائے تو لے ان کے قدم

ان شعروں میں جو صرف اردو دیوان میں مندرج ہیں، غالب نے خضر کی تلمیح کو کس انداز سے اور کتنے نئے نئے مطالب و معانی کے اظہار کے لیے استعمال کیا ہے، اہلِ ذوق اس کا خود اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو شخص خضر کو ان کے تمام مالہ و ما علیہ کے ساتھ نہ جانتا ہو، اور ان کے بارے میں جو کچھ مشہور ہے اس سے پوری آگاہی نہ رکھتا ہو، وہ ان اشعار یا ان جیسے شعرا کے کلام سے کیا لطف اٹھائے گا۔ اس لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ اردو فارسی شعرا کی تمام تلمیحات کو مرتب کر کے شائع کیا جائے۔

چونکہ غالب کے کلام کا عالمی سطح پر مطالعہ کیا جانے لگا ہے، اس لیے غالب دوستوں کے اولین فرائض میں سے ہے کہ اس کی برتی ہوئی تلمیحوں کی محققانہ تشریح و توضیح کی جائے۔ مجھے بیحد مسرت ہے کہ میرے فاضل دوست جناب محمود نیازی صاحب نے جو بریلی کے شہرۂ آفاق بزرگ شاہ نیاز احمد نیاز رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان کے ایک ذی علم اور صاحبِ ذوق فرد ہیں، یہ فرض انجام دے کر اربابِ علم کی خدمت میں پیش کیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس کی خاطر خواہ قدر کی جائے گی اور ہمارے ملک اور بیرونِ ملک کے تمام غالب دوست اس پیش کش پر ان کے شکر گزار ہوں گے۔

خداوند عالم نیازی صاحب کو سلامت با کرامت رکھے اور اس سے بھی برتر کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

امتیاز علی عرشی

دیباچہ

ہماری قدیم تاریخ، رسم و رواج، اوہام و عقائد، مشاغل اور جنگ و جدل کے واقعات سے ہزاروں قصّے کہانیاں اور داستانیں وابستہ ہیں۔ ان کو جاننے سے ہم کو اپنی معاشرتی، تمدنی، سماجی اور مذہبی سرگرمیوں کا پتہ چلتا ہے۔ ان میں جو تبدیلیاں اور اصلاحات ہوئی ہیں ان کا علم حاصل ہوتا ہے اور پچھلے لوگوں کے تجربات سے فائدہ پہنچتا ہے۔ ان طول طویل واقعات کو دہرانے سے چونکہ وقت ضائع ہوتا ہے اس لیے ایسے مختصر اشارے ایجاد کر لیے گئے ہیں جو اِن قصّے کہانیوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ان اشاروں کو علم بدیع کی اصطلاح میں تلمیح کہا جاتا ہے۔ ان الفاظ کو سنتے ہی پورے واقعہ کی تصویر ہمارے سامنے خود بخود آجاتی ہے اور تفصیل کے ساتھ واقعہ بیان کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ ان اشاروں یا تلمیحی الفاظ کے لیے یہ شرط لازمی ہے کہ ان سے متعلق قصّے، کہانیاں اور مسائل عام فہم ہوں اور ان کو دائمی شہرت حاصل ہو۔ اگر وہ مشہور اور عام فہم نہیں ہیں تو ان کو تلمیح نہیں کہا جا سکتا ہے۔ اس طرح وہ تمام لغت، محاورے، ضرب الامثال اور کہاوتیں تلمیح کے دائرے میں آتی ہیں جن سے کوئی قصّہ یا کہانی وابستہ ہے اور عام طور پر لوگ ان کے قصّوں سے واقف ہیں۔

تلمیح کو استعمال کرنے کا اصل مقصد کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معانی و مطالب کی ادائیگی ہے۔ اگر ہر بات کو تفصیل سے کہا جائے اور طول طویل کہانیاں اور قصّوں کو بار بار دہرایا جائے تو سننے والے بھی اکتا جاتے ہیں اور کہنے والے کا بھی وقت ضائع ہوتا ہے۔ اسی بات کو اگر اشاروں میں بیان کر دیا جائے تو گفتگو میں فصاحت اور بلاغت پیدا ہو جاتی ہے اور سامع کو بھی ہر بار نیا لطف محسوس ہوتا ہے۔ تلمیحی الفاظ گو مختصر ہوتے ہیں لیکن اپنے اندر وسیع مطالب پنہاں رکھتے ہیں۔ اس لیے علم و فضل رکھنے والے دانشور اور مدبّر تلمیحی گفتگو کو پسند کرتے ہیں۔

صاحب المعجم مولانا شمس قیس تلمیح کی تعریف میں لکھتے ہیں:

"تلمیح آنست کہ الفاظ اندک بر معانی بسیار دلالت کند و لمع جستن برق باشد و لمحہ یک نظر بود و چوں شاعر چناں سازد کہ الفاظ اندک بر معانی بسیار دلالت کند آں را تلمیح خوانند۔ و ایں صنعت بہ نزدیک بُلغا پسندیدہ تر از اطناب است و معنی بلاغت آنست کہ آنچہ در ضمیر باشد، بہ لفظی اندک بے آنکہ بہ تمام معنی آں اخلالے راہ یابد بیان کند و در آنچہ بہ بسط سخن احتیاج افتد از قدر حاجت در نگذارند۔ و اہل نقد گفتہ اند بلاغت لفظ نیکوست با صحّت معنی۔ و فصاحت پاکیزگی سخن است از دشواری بلاغت در سہ نوع سخن پیدا شد ایجاز و مساوات و بسط۔"

(المعجم ص ۱۷۷)

یہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ تلمیحی الفاظ کی بنیاد مشہورات پر ہوتی ہے یعنی جو قصہ جس طرح بھی عام لوگوں میں مشہور ہے اس کو ویسا ہی سمجھا جاتا ہے۔ اس میں عقل و نقل یا تنقید و تبصرہ کی گنجائش نہیں ہوتی۔ ان سے ہمارے ادیبوں اور شعراء کے خیالات اور قوتِ تخیّل کا اندازہ ہوتا ہے اور ضرورت کے وقت تشبیہ دینے میں آسانی ہوتی ہے۔

طویل القامت اور احمق شخص کو عام طور پر عوج سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ عوج بن عوق کی کہانی سب جانتے ہیں کہ یہ افسانوی شخص اس قدر دراز قامت تھا کہ نوحؑ کا طوفان اس کی کمر کمر تھا یا اس کے ساقِ پا سے رُودِ نیل کا پُل بنا تھا۔ تلمیحی نقطۂ نظر سے درازقامتی کا یہ ایک نادر نمونہ اور انوکھی تشبیہ ہے۔ حقیقت میں عوج بن عوق تھا بھی یا نہیں اس کی تحقیق کا کام علماء اور محققین کا ہے تلمیح نگار کا نہیں۔

تلمیحی الفاظ کے رواج سے ادیب اور شعراء کو آسانیاں فراہم ہو جاتی ہیں۔ وہ اپنے خیالات اور افکار کو مناسب سانچوں میں ڈھالنے پر قادر ہو جاتے ہیں اور کم وقت میں زیادہ کام کر سکتے ہیں۔ اس لیے ادبی حیثیت سے اُن زبانوں کو مالدار سمجھا جاتا ہے جن میں تلمیحات کا استعمال کثرت سے ہوتا ہے۔ انگریزی زبان کی مثال ہی موجود ہے۔ اس میں ہر قوم، ہر مذہب اور ہر ملک کے لٹریچر کی تلمیحات شامل ہیں اور ان میں برابر اضافہ ہو رہا ہے شاہنامہ فردوسی، گلستان و بوستان، الف لیلہ ولیلہ، لیلیٰ مجنوں، شیریں و فرہاد اور اسی قسم کی سیکڑوں مشرقی علوم کی کتابوں سے تلمیحات اخذ کر کے ادبیات یورپ میں داخل کی جا چکی ہیں۔ برخلاف اس کے ہماری ہندستانی زبانیں اور خصوصاً اردو کا دامن تلمیحات سے خالی ہے۔ اس کی بہ ظاہر وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ وقت کی بہتات اور مشاغل کی کمی سے ہم لوگ تفصیلی گفتگو کے عادی ہو چکے ہیں۔ مولانا وحیدالدین سلیم مرحوم نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے۔ "ہمارے ملک ہندستان کے لوگ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ تلمیح کی جگہ ہر قصہ کو تفصیل سے بیان کیا جائے۔ ان کو اس بات کی مطلق پرواہ نہیں ہوتی ہے کہ تلمیح کے مفہوم کو جملوں میں ادا کرنے سے کتنا وقت ضائع ہوتا ہے اور ایک طول طویل واقعہ کو بار بار دہرانا سننے والوں کو کس قدر ناگوار گزرتا ہے۔"

اردو میں تلمیحات کا استعمال بہت کم ہوتا ہے۔ اِس زبان میں جو قدیم تلمیحات مستعمل ہیں اُن سے واقفیت بھی دن بہ دن کم ہوتی جا رہی ہے کیونکہ جن زبانوں سے

اردو میں تلمیحات آئی ہیں اب خود ان کی مقبولیت کم ہوگئی ہے۔ ہمارے ذہن عام طور پر نئی تلمیح کو قبول کرنے پر آمادہ بھی نہیں ہوتے اور صرف ان الفاظ کو ہی تلمیح سمجھتے ہیں جو کتاب در کتاب (سینہ بہ سینہ ہیں)، چلی آرہی ہیں اور درسی کتابوں تک محدود ہیں ان کی تشریح کا مسئلہ بھی کورس کی کتابوں میں دیے ہوئے مختصر سے "فٹ نوٹ" سے حل ہو جاتا ہے۔ تلمیحات کی طرف سے اس بے اعتنائی کی اصل وجہ یہ ہے کہ اردو میں تلمیحات پر کام بہت کم ہوا ہے۔ تلمیحات کی کوئی فرہنگ موجود نہیں ہے اور تلمیحی الفاظ کی کوئی واضح تعریف اور شکل متعین نہیں ہے۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ اردو میں رائج تمام تلمیحات کو جمع کر کے مختلف موضوعات کی فرہنگیں مرتّب کی جائیں۔ ان میں قدیم، جدید، تاریخی غیر تاریخی، سیاسی ادبی اور مذہبی تلمیحات سب ہی موجود ہوں۔ شعرا اور ادیبوں نے جو تلمیحات ایجاد کی ہیں ان کو تلاش کیا جائے اور ہماری بول چال میں جو الفاظ تلمیح کی صورت اختیار کر چکے ہیں ان کو بھی تلمیحی فرہنگ میں شامل کیا جائے۔ مثلاً ایک جدید تلمیح "جنگِ آزادی" ہے۔ اس لفظ کو سنتے ہی ہماری آنکھوں کے سامنے وہ تمام واقعات سینما کے پردے کی مانند گزر جاتے ہیں جو ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک اس عظیم جدوجہدِ آزادی میں پیش آئے۔ آزادی کے پرستاروں کی قید و بند کی مصیبتیں، دار و رسن کی آزمائشیں، حکومت کے مظالم اور اس کے جواب میں اختیار کیے گئے تمسک[1] بالحق کے طریقے۔ یہ سب واقعات سب لوگ جانتے ہیں اور مشہور ہیں۔ اس لیے یہ لفظ تلمیحی لفظ کی شرائط پوری کرتا ہے۔ اسی طرح سے بے شمار الفاظ ایسے ہیں جن کو تلمیحی فرہنگ میں شامل کیا جانا چاہیے۔ اس فرہنگ کا سب سے بڑا کام یہ ہوگا کہ وہ لوگ جو صرف اپنی ذات یا اپنے آبا و اجداد کے کارناموں سے ہی رغبت رکھتے ہیں، تلمیحات سے دلچسپی

---

[1] ستیہ گرہ

لینے لگیں گے۔ تلمیحی واقعات عام لوگوں کے ذہنوں میں محفوظ ہو جائیں گے اور پھر اُن کا استعمال عام گفتگو اور بول چال میں بھی ممکن ہو سکے گا۔

یہ پہلے ہی عرض کیا جا چکا ہے کہ کسی بھی زبان کو بین الاقوامی سطح تک لانے اور اُس میں فصاحت اور بلاغت پیدا کرنے کے لیے تلمیحات کا بہ کثرت استعمال ضروری ہے۔ اس لیے ایک اہم کام یہ ہے کہ اردو کے مستند ادیبوں اور شاعروں نے جو عام تلمیحات استعمال کی ہیں اور وہ تلمیحات جو انہوں نے اپنی ایجاد کی ہیں، ان سب کو تلاش کر کے یکجا کر دیا جائے۔ اردو کی بہت سی کتابیں مثلاً فسانہ آزاد، باغ و بہار، مراۃ العروس، بنات النعش اور توبۃ النصوح وغیرہ ایسی ہیں جن کی سیکڑوں تلمیحات ہمارے ادب میں شامل کی جا سکتی ہیں۔ اکثر لوگ خوجی کی قرولی، جانعالم کا طوطا، مرزا ظاہر دار بیگ، اصغری اکبری، خواجہ سگ پرست، اختو بختو اور الہ دین کے چراغ کی تلمیحات کو استعمال بھی کرتے ہیں۔ اسی طرح بہت سے شعراء ایسے ہیں جنہوں نے تلمیحات کا استعمال بکثرت کیا ہے جیسے میرؔ، سوداؔ، نظیرؔ، ذوقؔ، غالبؔ، رشکؔ، سحرؔ، قلقؔ اور جان صاحب وغیرہ ایسے شعراء کی مخصوص تلمیحات کو جمع کرنے سے اردو کا دامن مالا مال ہو سکتا ہے۔ اس سلسلے میں مرزا غالبؔ کی تلمیحات پیش کی جاتی ہیں۔

مرزا صاحب کا کلام ویسے تو ایک بحر ناپیدا کنار ہے لیکن اس کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ اس سے ہر شخص بقدر ظرف مستفیض ہو لیتا ہے۔ اُن کے کلام کا بڑا حصہ عام فہم اور آسان ہے لیکن جو باقی رہتا ہے وہ عام فہم و درک سے بلند ہے۔ ان کے کلام کی نکتہ آفرینیوں، فارسی محاوروں اور ترکیبوں اور مخصوص طرز بیان تک ہر شخص کی رسائی ممکن نہیں ہے۔ ان کے فلسفہ و تصوّف کے غوامض اور عمیق اصطلاحات کو سمجھنے کے لیے ایک خاص بلوغتِ نظر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے اُن کے کلام کی رمزیت نے ضرب المثل کی صورت اختیار کر لی ہے۔ مرزا غالب پر اس وقت بین الاقوامی سطح پر کام ہو رہا ہے اور تمام دنیا کے

لوگ اس عظیم ہندوستانی شاعر کو خراجِ تحسین پیش کر رہے ہیں۔ اس لیے یہ ضرورت ہے کہ ان کے کلام کی تمام اشکال واضح طور پر سامنے لائی جائیں تاکہ ان کے طالب علموں کو سہولت حاصل ہو۔ اس سلسلہ کی ایک کڑی "تلمیحات غالب" بھی ہیں۔ مرزا صاحب نے بھی دوسرے شعرا کی مانند کلام میں تلمیحات کا استعمال کیا ہے لیکن ان کی تلمیحات بھی اُن کے خصوصی لب و لہجہ اور فلسفیانہ شاعری سے گہرا تعلق رکھتی ہیں۔ اگر ان تلمیحات سے متعلق قصّوں سے واقفیت نہ ہو تو ان کے کلام کا حقیقی لطف اٹھانا مشکل ہے۔ ان کا ایک سادہ سا شعر ہے ؎

دُرِ معنی سے مرا صفحہ لقا کی ڈاڑھی
غمِ گیتی سے مرا سینہ عُمَر کی زنبیل

یہ شعر دقیق نہیں بلکہ عام فہم ہے لیکن اس کے معنی کی وسعت کو صرف وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو لقا کی ڈاڑھی اور عمر کی زنبیل سے واقف ہو اور یہ دونوں تلمیحات کسی لغت میں مل نہیں سکتی ہیں۔ میری اس تالیف کا مقصد صرف ایسے ہی قصّوں سے واقفیت کرانا ہے۔ کیونکہ اس ضرورت کی طرف ابھی تک کسی نے توجہ نہیں کی تھی۔ اس وقت صرف ان کے اردو کلام کی تلمیحات کو جمع کیا گیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ انشاءاللہ آئندہ ان کے فارسی کلام کی تلمیحات کو بھی اس میں شامل کر کے یہ کام مکمّل ہو جائے گا۔ تلمیحات کی تلاش میں میرے سامنے دیوانِ غالبؔ نسخۂ عرشی کا زیرِ طبع ایڈیشن رہا ہے اس لیے ان میں ایسے اشعار بھی شامل ہیں جو ابھی تک منظرِ عام پر نہیں آئے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ یہ کتاب وقت کی ایک بڑی ضرورت کو پورا کرے گی اور غالبؔ سے دل چسپی رکھنے والے حضرات کے لیے سہولت پیدا کرے گی۔

اس سلسلہ میں مجھے جناب مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشی کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرنا ہے کہ انہوں نے باوجود اپنی علمی مصروفیات کے میرے مسودہ کا بہ نظر غائر مطالعہ فرمایا اور بہت سی خامیوں کی نشان دہی کی جو دور کر دی گئی ہیں۔ رامپور کی لائبریری سے استفادہ

کرنے کی جو سہولتیں مجھے ملی ہیں، ان کے لیے بھی میں عرشی صاحب اور دیگر اراکینِ لائبریری کا شکرگزار ہوں۔

اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہے کہ میرا یہ کام برادرِ محترم ڈاکٹر خواجہ احمد صاحب فاروقی مدظلہ، صدر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کی توجہ و عنایت کا نتیجہ ہے۔ آج سے تقریباً پندرہ سال قبل میں نے ان کی تحریک اور ترغیب پر اردو تلمیحات کا کام شروع کیا تھا جو بفضلہ تعالیٰ برابر جاری ہے۔

محمود نیازی

۲۴ر دسمبر ۱۹۷۱ء

نمرُود کی خُدائی

نمرود عراق کے بادشاہ کا قدیم لقب ہے۔ یہ بادشاہ رعایا کا معبود بھی ہوتا تھا اور لوگ اس کی پرستش بھی کرتے تھے۔ اس لیے نمرود کی خدائی سے مراد باطل اور ناقص خدائی ہے۔ صاحب روضتہ الصفا نے مشہور اور معروف نمرود کا نام کیکاؤس لکھا ہے۔ اس کا تعلق حضرت ابراہیم کے زمانے سے ہے۔ نمرود کی اصل لَم یَمُت ہے یعنی وہ شخص جو کبھی نہ مرے۔ اس کا مفرس "نہ مُرد" کثرتِ استعمال سے نمرود بن گیا۔

مشہور ہے کہ نمرود شروع میں سخی اور عادل بادشاہ تھا لیکن شیطان نے جب اس کو ورغلایا تو گمراہ ہو گیا اور خدائی کا دعویٰ کرنے لگا۔ اس نے اپنی صورت کے بُت تمام ہیکلوں میں بھجوا دیے تھے تاکہ دوسرے دیوتاؤں کی مانند اس کی پرستش بھی ہو۔ وہ زمانہ حضرت ابراہیمؑ کا تھا۔ انہوں نے نمرود کی اصلاح کی بہت کوشش کی لیکن وہ راہ راست پر نہیں آیا۔ حضرت ابراہیمؑ اور نمرود کے درمیان ایک طویل مناظرہ بھی ہوا تھا جس میں نمرود اپنی خدائی ثابت کرنے میں ناکام رہا۔ اِس کی شرمندگی اور جھنجھلاہٹ میں اُس (نمرود) نے حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں ڈال دیا لیکن وہ آگ ان کا بال بھی بیکا نہ کر سکی اور سرد ہو کر گلزار بن گئی۔ اس

واقعہ کے لیے اردو میں آتشِ نمرود، شعلۂ نمرود، گلشنِ خلیل[1]، گلزارِ ابراہیم اور گلستانِ ابراہیم کی تلمیحات بھی مستعمل ہیں۔

اِس آگ کو شعلۂ نمرود اور آتشِ نمرود اس لیے کہا جاتا ہے کہ شاید یہ دنیا کی سب سے شدید آگ تھی۔ نمرود کے حکم سے ایک فرسنگ مربع میں آگ کا ایک الاؤ روشن کیا گیا تھا۔ اس آگ کے شعلے اتنے بلند تھے کہ اس پر سے پرند بھی اُڑ کر نہیں گزر سکتے تھے اور اس کی تپش سے چار چار فرلانگ تک کسی ذی روح کا رہنا محال تھا۔ ایک بڑی سی منجنیق[2] میں رکھ کر ابراہیمؑ کو آگ میں پھینک دیا گیا۔ خدا کی قدرت اور حکم پر اس آگ نے حضرت ابراہیمؑ کا بال بھی بیکا نہ کیا اور وہ فوراً سرد ہو کر گلزار بن گئی۔ اس میں آبِ شیریں کے چشمے جاری ہو گئے اور طرح طرح کے پھول کھِل گئے۔ اِس آگ کو تلمیحاً گلستانِ خلیل، گلشنِ ابراہیم اور گلزارِ ابراہیم اسی لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

مشہور ہے کہ نمرود نے چار سو سال تک بندگانِ خدا کو گمراہ کیا تھا اور باطل خدائی چلائی تھی۔ حضرت ابراہیم نے طرح طرح کے معجزے دکھائے۔ عذابِ الٰہی سے ڈرایا، دھمکایا اور آخر آسمانی لشکر کی دھمکی دی لیکن نمرود پر کوئی اثر نہ ہوا اور وہ اپنی نادانی سے باز نہ آیا بلکہ اس نے للکار کر کہا کہ اگر کوئی فوج آسمان کے بادشاہ کی ہے تو لاؤ اور میری طاقت کا تماشہ دیکھو۔ حضرت ابراہیمؑ نے بارگاہِ الٰہی میں دعا کی جو مقبول ہوئی۔ جبریل نے آکر کہا "نمرود سے کہہ دو ہماری فوج آتی ہے وہ اپنی فوج تیار کرے۔"

نمرود نے بھی تین دن میں تین لاکھ فوج جمع کر لی اور ایک میدان میں اکٹھا کرنے کے

---

[1] خلیل کے معنی سچّے دوست کے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کو بارگاہِ الٰہی سے خلیل کا خطاب ملا تھا۔

[2] منجنیق بڑے قسم کے فلاخن یا گوپھن کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ بڑے بڑے پتھر قلعہ پر مار کر دیوار کو توڑا جاتا تھا۔ بعض کے نزدیک یہ علم جرِ ثقیل سے چلنے والی مشین کا نام ہے جس کے وسیلہ سے دیوارِ قلعہ کو توڑا جاتا تھا۔

بعد حضرت ابراہیمؑ کو للکارا کہ کہاں ہے تمہاری فوج اُسے بلاؤ۔ اسی وقت آسمان سے ایک زبردست فوج مچھروں کی نمودار ہوئی اور اس نے چشم زدن میں نمرودی فوج کو ہلاک کر دیا۔ نمرود بھاگ کر اپنے محل میں چھپ گیا۔ ایک لنگڑا اور کمزور مچھر وہاں بھی اس کے تعاقب میں پہنچا اور اس نے نمرود کے دماغ میں گھس کر وار کیے۔ نمرود چالیس روز تک اس عذابِ الٰہی میں مبتلا رہ کر ذلت اور رسوائی کے ساتھ مرا۔

غالب ؎
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

سدِّ سکندر

سدِّ سکندر کنایۃً مضبوط اور پائدار دیوار اور رکاوٹ کے لیے مستعمل ہے۔ یہ دیوار سکندر ذُوالقرنین نے یاجوج ماجوج[1] کے حملوں کو روکنے کے لیے کسی نامعلوم مقام پر بنوائی تھی۔

---

[1] یاجوج ماجوج ایک غیر مہذب اور خوں خوار قوم کا نام ہے جو کاکیشیا یعنی کوہِ قاف کے پہاڑی سلسلوں کے کسی درّے میں سکندر ذوالقرنین کو ملی تھی جو اپنے پڑوسیوں کو پریشان کرتی تھی۔ اسرائیلی روایتوں کے مطابق اِس کے عجیب عجیب افسانے مشہور ہیں مثلاً یہ لوگ بالشت ڈیڑھ بالشت کا قد رکھتے ہیں۔ ان کے کان اتنے بڑے ہیں کہ ایک اوڑھنے اور ایک بچھانے کے کام آتا ہے۔ ایسی مخلوق ہے جو آدمؑ کے صُلب سے ہے مگر حوّا کے بطن سے نہیں ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب باطل روایتیں ہیں۔ حقیقت میں یہ منگولیا کے وحشی قبائل ہیں جن کو یونانی لوگ گاگ میگاگ کہتے تھے۔ معرب ہو کر یاجوج ماجوج بن گئے۔

اس دیوار کو لوہے اور تانبے کی آمیزش سے تیار کیا گیا تھا اور اس کی وجہ سے کاکیشیا کے نیچے بسنے والے لوگ اور تبّت و چین کے باشندے یاجوج ماجوج کی چیرہ دستیوں سے محفوظ ہو گئے تھے۔ مشہور روایت ہے کہ اس دیوار کو یاجوج ماجوج رات کے وقت چاٹتے رہتے ہیں اور جب اس کے انہدام میں دوسرے دن کی محنت باقی رہ جاتی ہے یا یہ ایک کاغذ برابر موٹی رہ جاتی ہے تو قدرتِ الٰہی سے شب بھر میں پھر صحیح و سالم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح سے یہ سلسلہ ہزاروں برس سے جاری ہے۔ قیامت کے آنے میں جب صرف نفخ صور کا مرحلہ باقی رہ جائے گا تو یہ دیوار خود بخود ہی ٹوٹ جائے گی اور یاجوج ماجوج دنیا پر یلغار کر دیں گے۔

سدِ سکندر کو دیوارِ قہقہہ بھی کہا جاتا ہے۔ مشہور ہے کہ اس کی دوسری طرف جو شخص بھی دیکھتا ہے وہ قہقہے لگانے لگتا ہے اور اسی عالم میں اس کی موت ہو جاتی ہے۔

یاجوج ماجوج کے حملوں کو روکنے کے لیے متعدد دیواریں تعمیر ہوئی ہیں۔ اُن میں سے ایک دیوارِ چین ہے جس کو سنہ ۲۴۰ ق م میں چینگ وانگ نے بنوایا تھا۔ دوسری دیوار بخارا اور ترمذ کے قریب دربند کے علاقے میں ہے۔ ی دیوار روسی علاقہ داغستان کی باب الابواب کے نام سے مشہور ہے۔ چوتھی دیوار سدِ کوہِ قاف کہلاتی ہے۔ اکثر علماء کے نزدیک یہ دیوار ہی سدِ سکندر ہے۔ مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ کے نزدیک ان چاروں دیواروں میں سے کوئی دیوار بھی تصریحاتِ قرآنی کے مطابق نہیں ہے۔ اس طرح یہ کہنا دشوار ہے کہ سدِ سکندر کہاں واقع ہے۔

غالب ؎

حیرتِ اندازِ رہبر ہے عناں گیر اے اسدؔ
نقشِ پائے خضر یاں، سدِ سکندر ہو گیا

تختِ کَے

"کَے" کے معنی بادشاہِ عالی مرتبت اور بلند قدر کے ہیں۔ کیانی اس کی جمع ہے۔ فردوسی نے اسلام سے قبل ایران کے چار شاہی خاندانوں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں پیشدادی خاندان کے بعد دوسرا خاندان کیانی ہے۔ اس خاندان کے بادشاہوں میں کیقباد، کیخسرو، کیکاؤس اور لہراسپ وغیرہ مشہور ہیں۔ یہ تمام بادشاہ اُلوالعزم اور شان و شوکت والے تھے۔ زال اور رستم جیسے نامور پہلوان اِن کے یہاں ہی ملازم تھے۔ اِن کا دورِ حکومت تاریخِ ایران کا زرّیں باب ہے حالاں کہ اِن سب کا تعلق ایران کے قومی افسانے سے ہے۔ اس لیے تختِ کَے کنایتہً ایسے تخت کو کہتے ہیں جس پر صاحب جبروت اور عظیم بادشاہ بیٹھتا ہو۔

غالبؔ ؎

جس دل میں "تا بہ کے" سما جائے
واں عزتِ تختِ کَے نہیں ہے

ذوالفقار

ذوالفقار کے معنی مہرہ ہائے پشت والے کے ہیں۔ یہ اُس مشہور تلوار کا نام ہے جو آنحضرت صلعم کو معرکۂ بدر میں ملی تھی۔ مشہور ہے کہ اس تلوار کی پشت پر مہرہ ہائے پشت کی

قطار تھی یعنی اس کی سطح عدیم الارتفاع تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کی نو زبانیں تھیں۔ عام طور پر دو زبانوں والی تلوار پر ہی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ یہ تلوار آنحضرت صلعم نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو عطا کر دی تھی جس کی وجہ سے آپ کو صاحبِ ذوالفقار کہا جاتا ہے۔ یہ تلوار عباسی خلفاء تک باقی رہی تھی۔

غالب ؎
دیکھنے میں ہیں گرچہ دو، پر ہیں یہ دونوں یار ایک
وضع میں گو ہوئی دو سر، تیغ ہے ذوالفقار ایک

ذوالفقار کو ذوالفقار شہ مرداں بھی کہا جاتا ہے کیوں کہ شہ مرداں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا لقب ہے اس کے معنی سردارِ دلاورانِ صف شکن ہیں۔

غالب ؎
موجِ طوفانِ غضب، چشمۂ نہ چرخِ حباب
ذوالفقارِ شہِ مرداں، خطِ قدرت آثار

بوئے یوسف / بوئے پیراہن

بوئے یوسف سے مُراد پیراہن یوسف کی خوشبو ہے جس کی وجہ سے حضرت یوسفؑ کے والدِ ماجد حضرت یعقوبؑ کی آنکھوں کی کھوئی ہوئی بینائی واپس آگئی تھی۔ حضرت یوسفؑ بنی اسرائیل کے جلیل القدر پیغمبر تھے۔ ان کے دس سوتیلے بھائی اور ایک حقیقی بھائی بن یمین تھے۔ حضرت یوسفؑ کے ایک خواب کی تعبیر میں جب اُن کے والد نے پیغمبری کی بشارت دی تو سوتیلے بھائی جلنے لگے تھے۔ ایک دن سوتیلے بھائی حضرت یوسفؑ کو جنگل لے گئے اور ہلاک کرنے کی

نیت سے ان کو اندھے کنوئیں میں پھینک آئے اور باپ سے کہہ دیا کہ یوسفؑ کو بھیڑیا کھا گیا ہے۔ جب یوسفؑ کی موت نہ ہوئی تو اُن کے بھائیوں نے ان کو کھوٹے درموں میں مصری سوداگروں کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ اِن سوداگروں سے عزیزِ مصر فوطیفار نے حضرت یوسف کو خرید لیا۔ عزیزِ مصر کی حسین و جمیل بیوی زلیخا جب حضرت یوسفؑ سے عشق کرنے لگی تو اس جُرم میں وہ زندان میں ڈالے گئے۔ وہاں کی صعوبتیں سہنے کے بعد جب حضرت یوسفؑ کی بے گناہی ثابت ہو گئی تو فرعونِ مصر نے ان کو ہی عزیزِ مصر بنا کر اپنے ملک کا مختارِ کُل بنا دیا۔ اُدھر کنعان[1] میں حضرت یوسفؑ کی جدائی اور فرقت میں روتے روتے حضرت یعقوبؑ نے اپنی آنکھیں کھو دی تھیں۔ اُنہیں دنوں میں کنعان میں شدید قحط پڑ گیا اور برادرانِ یوسفؑ غلّہ لینے کے لیے مصر گئے۔ انہوں نے تو عزیزِ مصر کے روپ میں اپنے بھائی کو نہ پہچانا لیکن حضرت یوسفؑ نے اُن کو شناخت کر لیا۔ انہوں نے بہانہ سے اپنے والد اور بھائی کی خیریت بھی معلوم کر لی۔ اُن لوگوں کو خواہش کے مطابق غلّہ دے کر حضرت یوسفؑ نے یہ کہہ دیا تھا کہ اگر وہ دوبارہ بِن یمین کو ساتھ نہ لائے تو غلّہ نہ ملے گا۔ دوسری بار جب دسوں بھائی اپنے ساتھ بِن یمین کو بھی مصر لے گئے تو اِس بار ان لوگوں نے حضرت یوسفؑ کو بھی پہچان کر اپنے قصور کی معافی مانگ لی حضرت یوسفؑ نے اُن کو نہ صرف معاف کر دیا بلکہ بہت سا غلّہ بھی دیا۔ ساتھ ہی اپنا ایک پیراہن بھی دے کر کہا کہ "اس کو کنعان لے جا کر باپ کی آنکھوں پر ڈال دینا۔ انشاء اللہ اس کی خوشبو سے اُن کی آنکھیں روشن ہو جائیں گی"۔ برادرانِ یوسفؑ کا قافلہ پیراہن لیے ہوئے کنعان کے قریب پہنچا تو حضرت یوسفؑ کی خوشبو سے باپ پہلے ہی باخبر ہو گئے۔ انہوں نے اپنے رشتہ داروں سے کہا "اے خاندانِ یعقوبؑ اگر تم یہ نہ کہو کہ بڑھاپے سے اس کی عقل ماری گئی ہے تو میں

---

[1] کنعان نواحِ شام کا ایک چھوٹا سا موضع تھا جس میں مدنیت اور حضارت کا نام و نشان نہ تھا۔ خس پوش جھونپڑیوں میں نسلِ ابراہیمی کا قبیلہ آباد تھا جن کا دار و مدارِ رزق شکار اور گلّہ بانی تھا۔

یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مجھے یوسفؑ کی مہک آرہی ہے۔" اُن لوگوں نے حضرت یوسفؑ کے خاتمہ پر یقین دلاتے ہوئے حضرت یعقوبؑ کا مذاق اُڑایا۔

غالبؔ ؎ بہرِ جاں پروردنِ یعقوب، بالِ خاک سے
دام لیتے ہیں پرِ پرواز، پیراہن کی بُو

برادرانِ یوسفؑ کا قافلہ جب بخیریت تمام کنعان پہنچ گیا تو انہوں نے باپ کے سامنے سب سے بڑی جو سوغات پیش کی وہ پیراہنِ یوسفؑ تھا۔ اس نے جلوۂ یوسفؑ کی تاثیر دکھائی اور شمیمِ یوسفؑ سے اُن کی آنکھیں فوراً روشن ہو گئیں۔

غالبؔ ؎ یک چمن جلوۂ یوسف ہے بہ چشمِ یعقوب
لالہ ہا داغ برافگندہ و گلہا بے خار

عُمرِ خضر / عُمرِ جاوداں

عمرِ خضر، حیاتِ جاوداں اور عمرِ دوام کے لیے مستعمل ہے۔ کنایتہً دعائے درازیٔ عمر کے لیے آتا ہے۔ حضرتِ خضرؑ ایک مشہور پیغمبر کا نام ہے۔ اس نام سے اُن کا ذکر قرآن مجید میں نہیں آیا ہے لیکن اللہ کے حکم پر حضرت موسیٰؑ نے جس مردِ صالح سے ملاقات کی تھی اُن کو خضر ہی سمجھا جاتا ہے۔ یہ بات بھی صاف نہیں ہے کہ وہ عبدِ صالح[1] نبی تھا یا نہیں۔ با اگر اسی عبدِ صالح کا

---

[1] حضرت موسیٰؑ نے اِس عبدِ صالح سے مجمع البحرین (جہاں دو سمندر ملتے ہیں) جاکر ملاقات کی تھی اور ۱۸ ماہ تک معاشر و مصاحب رہ کر خصوصی تعلیم حاصل کی تھی۔

نام خضر تھا تو یہ حیاتِ جاوداں والے خضر ہیں یا دوسرے۔ بہر حال عام طور پر خضرؑ کو پیغمبر اور عمرِ دوام رکھنے والا سمجھا جاتا ہے۔ اردو و فارسی ادب میں ان کا کام بحر و بر کی رہنمائی، جہازوں کی رہبری، طوفان میں مصیبت زدوں کی مدد اور بھولے بھٹکوں کو راستہ بتاتا ہے۔

غالب ؎ سیرِ آں سُو ہے، تماشا ہے طلب گاروں کا
خضر، مشتاق ہے اس دشت کے آواروں کا

خضر کو سکندر ذوالقرنین کا وزیر بتایا جاتا ہے۔ سکندر حضرت خضرؑ کی رہنمائی میں ظلمات میں چشمۂ آبِ حیواں تک پہنچا تھا لیکن آب حیواں یا آبِ بقا یا آب حیات یا آبِ زندگی پینے والوں کا انجام دیکھ کر سکندر نے اس پانی کو نہ پیا اور خضر نے آبِ حیات پی کر عمرِ جاوداں پائی۔ اب لوگوں کی نظر سے پوشیدہ قیامت تک زندہ رہیں گے۔

غالب ؎ وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے

ایک روایت یہ بھی ہے کہ ظلمات کی تاریکی میں سکندر تو بھٹک گیا تھا صرف خضرؑ ہی چشمۂ آبِ حیات تک پہنچے تھے۔

اب عمرِ خضر طویل العمری کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور درازیٔ عمر کی دعا کے لیے بھی کہا جاتا ہے۔

غالب ؎ وحشتِ دردِ بے کسی، بے اثر اس قدر نہیں
رشتۂ عمرِ خضر کو، نالہ نارسا سمجھ

کہتے ہیں کہ حضرت خضرؑ شیراز سے دو فرلانگ کے فاصلہ پر حضرت موسیٰؑ کے زمانے میں پیدا ہوئے تھے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کو مبارک قدم اور خجستہ پے بھی کہا جاتا ہے۔ کیوں کہ مشہور ہے کہ ان کے قدم سے سبزہ پیدا ہو جاتا ہے اور جس مقام سے گزر جاتے ہیں وہ جگہ ہمیشہ کے لیے سرسبز و شاداب

ہو جاتی ہے۔

غالب ؎ مشقِ نقشِ قدم، نسخۂ آبِ حیواں
جادۂ دشتِ نجف، عمرِ خضر کا طومار

ساقیِ کوثر

کوثر بہشت کی ایک نہر کا نام ہے۔ اس کے پانی کو آبِ کوثر اور شرابِ طہور بھی کہا جاتا ہے۔ اس نہر کا ذکر قرآن مجید نے سورۂ کوثر میں کیا ہے۔ اس کے پانی کے متعلق طبری نے لکھا ہے کہ "یہ برف سے زیادہ ٹھنڈا، شہد سے زیادہ میٹھا اور دودھ سے زیادہ سفید ہے"۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ دہر میں اس کو شراباً طہوراً کہا ہے جس کے معنی پاک شراب کے ہیں۔ درحقیقت یہ جنّت کے عیش و مسرّت کی اعلیٰ ترین مثال فہمِ انسانی کے لیے دی گئی ہے جس کا تخیل انسان کے لیے نہ دید ہے نہ شنید۔

اس نہر کے پانی کو آنحضرت صلعم بہشتیوں میں تقسیم فرمائیں گے، اس لیے آپؐ کو ساقیِ کوثر کہا جاتا ہے۔ شیعہ حضرات ساقیِ کوثر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو کہتے ہیں اور اردو ادب میں یہ تلمیح بیشتر آخر الذکر معنوں میں مستعمل ہوتی ہے۔

غالب ؎ کب تلک پھیرے اسدؔ لب ہائے تفتہ پر زباں
تابِ عرضِ تشنگی اے ساقیِ کوثر نہیں

غالبؔ ؎ بہت سہی، غمِ گیتی شراب کم کیا ہے
غلامِ ساقیِ کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے

غالبؔ ؎ واعظ، نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی

جامِ جمشید / جامِ جہاں نُما

جمشید ایران کا مشہور بادشاہ تھا۔ فردوسی نے اس کو پیشدادی سلسلہ کا چوتھا بادشاہ اور سلطان باجبروت شاہنامہ میں ظاہر کیا ہے۔ مشہور ہے کہ حکمائے فارس نے اس بادشاہ کے لیے ایک پیالہ شراب تیار کیا تھا جس کے اندر خطوط کھنچے ہوئے تھے۔ یہ سات خطوط تھے جن کے نام ترتیب وار حسب ذیل تھے: "خطِ جور، خطِ بغداد، خطِ بصرہ، خطِ ارزق، خطِ شکریہ، خطِ اشک اور خطِ ساگر۔" پہلے خط تک اگر شراب بھری ہو تو اُس کو سوائے بادشاہ کے اور کوئی نہیں پی سکتا تھا۔ دوسرے خط تک شراب بھر کر صرف شاہی خاندان کے لوگ ہی پی سکتے تھے۔ اس کے بعد ارکینِ سلطنت اور امرا۔ کا نمبر آتا تھا۔ اسی طرح درجہ بہ درجہ ہر طبقہ کے لیے ایک مخصوص خط تھا۔ اس جام کو ساغرِ جم بھی کہا جاتا ہے۔

غالبؔ ؎ اور بازار سے لے آئے، اگر ٹوٹ گیا
ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

اِسی قسم کا ایک پیالہ کیانی خاندان کے بادشاہ کے خسرو سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اِس

جام کو جامِ جہاں نما، جامِ جہاں بیں، جامِ خسرو اور جامِ گیتی نما کہتے ہیں۔ اس پیالہ میں خطوط کے علاوہ کچھ ہندسے بھی بنے ہوئے تھے اور جس طرح اصطرلاب کے خطوط سے ستاروں کا ارتفاع معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح جام کے ہندسوں سے ستاروں کی گردش اور مستقبل کے واقعات کا علم ہو جاتا تھا یا تمام عالم کے احوالِ خیر و شر کا پتہ چل جاتا تھا۔

غالبؔ ~ جامِ جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر
سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے

بعض لوگوں نے جامِ جمشید کی خصوصیات بھی جہاں بینی کی بتائی ہیں لیکن محققین کے نزدیک اس پیالہ میں ایسی کوئی بات نہ تھی۔ شراب کی ایجاد نئی نئی ہوئی تھی۔ یہ پیالۂ شراب بھی اہتمام سے تیار ہوا تھا اور انواع و اقسام کی صنعتوں سے مزین تھا۔

غالبؔ ~ خانۂ تنگ ہجومِ دو جہاں کیفیت
جامِ جمشید ہے یا قالبِ خشتِ دیوار

جمشید کا اصل نام جَم تھا۔ شید بمعنی شعاع اُس کا لقب تھا جو بعد کو نام کا ایک جز بن گیا (اس کی تفصیل نوروز میں دیکھیے) کچھ مورخین اور مولف چار چمن کے نزدیک جم اور سلیمان ایک ہی بادشاہ کے دو نام تھے لیکن پروفیسر براؤن نے اس کی تردید کرتے ہوئے ابن المقفع کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ان دونوں میں تین ہزار سال کا فاصلہ ہے۔ شاہنامہ فردوسی کے مطابق جم نے سات سو سال تک حکومت کی تھی۔ انسانوں کے علاوہ چرند پرند، جن و پریاں اور شیاطین بھی اس کے تابع تھے۔ اس کے زمانہ میں پہلی بار جنگی ہتھیار بنے، کاشتکاری جہاز سازی، ملاحی، غوطہ خوری اور جانوروں سے کام لینے کی ابتدا ہوئی۔ اس نے ہی جواہرات، عطریات، ادویات اور فلزات کا رواج دیا تھا۔

غالبؔ ~ ہوئی اس دور میں منسوب مجھ سے بادہ آشامی
پھر آیا وہ زمانہ، جو جہاں میں جامِ جم نکلے

اَسَداللہ

اُسداللہ، کے معنی "اللہ کے شیر" کے ہیں۔ یہ لقب حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو اُن کی بے پناہ قوت اور طاقت کی وجہ سے آنحضرت صلعم نے عطا فرمایا تھا۔ ایک بار آنحضرت صلعم نے ارشاد فرمایا کہ "۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ ابو سبطین یعنی حسنؑ و حسینؑ کے باپ ہیں جو جوانانِ بہشت کے سردار ہیں۔ یہ مجھ سے تکلیف دور کرنے والے اور اللہ کے شیر ہیں ۔ ۔ ۔ ۔" دوسری روایت کے مطابق جنگِ خیبر میں جب دروازۂ قلعہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ایک ہی جھٹکے میں اکھاڑ پھینکا تھا تو آنحضرت صلعم نے اس خطاب سے ممتاز فرمایا تھا۔ حضرت علیؓ کو اِسی لیے اَسدِ حق، اَسدِ کبریا، اَسدِ کِردگار اور اسد ذوالجلال بھی لکھا جاتا ہے۔

غاؔلب ؎

امامِ ظاہر و باطن، امیرِ صورت و معنی
علی، وَلی، اسداللہ، جانشینِ نبی

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ایک نام حیدر (شیر) بھی ہے جو آپ کی والدہ فاطمہ بنت اسد نے رکھا تھا۔ ایک روایت ہے کہ معرکۂ بدر میں مرحب کی رجز کے مقابلہ میں آپ نے جو رجز پڑھا اس کا مفہوم یہ تھا "میں وہ ہوں جس کی ماں نے اس کا نام حیدر رکھا تھا" اُسی لیے آپ کو حیدرِ کرار (دشمن پر حملہ کرنے والا شیر) اور حیدرِ صفدر (اللہ کا شیر) بھی کہا جاتا ہے۔

اَسَد ؎

اَسَد قدرت سے حیدر کی ہوئی، ہر گبر و ترسا کو
شرارِ سنگِ بُت، بہرِ بنائے اعتقاد آتش

وصفِ دُلدُل

دُلدُل وہ سفید خچّری تھی جس کو حاکمِ اسکندریہ نے آنحضرت صلعم کو تحفتاً پیش کی تھی۔ آنحضرت صلعم کو اس کی سواری بہت مرغوب تھی اور اکثر غزوات میں آپؐ نے اِس پر ہی سواری فرمائی تھی۔ اُس کی محبوبیت ہی سب سے بڑا وصف ہے اور رفتارِ نرم و نازک خِرام۔

غالب ؎
دشتِ تسخیر ہو گر، گردِ خرام دُلدُل
نعل در آتش ہر ذرّہ ہے تیغ کوہسار

غالب ؎
وصفِ دُلدُل ہے مِرے مطلعِ ثانی کی بہار
جنّتِ نقشِ قدم سے ہوں میں اُس کے گل چیں

آنحضرت صلعم نے اس خچّری کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو عطا فرما دیا تھا۔ اسی لیے آپ کو شہ دُلدُل سوار بھی کہا جاتا ہے۔

اَوْرَنگ زیبْ

اورنگ زیب سے مُراد اُس سوداوی پھوڑے سے ہے جو کئی سال تک ہرا رہتا ہے اور بہت دن میں ٹھیک ہوتا ہے۔ مشہور ہے کہ جب اورنگ زیب نے ابوالحسن تاناشاہ کا محاصرہ گولکنڈے کے مقام پر کیا تھا تو مدّتِ محاصرہ غیر معمولی طویل ہوگئی تھی۔ آب و ہوا کی خرابی سے

عالمگیری لشکر کے پھوڑے نکل آئے تھے اور ان پھوڑوں نے وبائی صورت اختیار کر لی تھی۔
اُسی وقت سے ان پھوڑوں کو اورنگ زیبی کہا جاتا ہے۔

غالب ~ نشاں باقی نہیں ہے سلطنت کا
مگر، ہاں، نام کو اورنگ زیبی

باغِ رضواں

رضواں اُس فرشتہ کو کہا جاتا ہے جو بہشت کی دربانی کے لیے مقرر ہے۔ اس کو دروغۂ بہشت بھی کہتے ہیں۔ اس لیے باغِ رضواں سے مُراد تمام بہشتوں سے ہے جن کا اندرونی انتظام اور بہشتیوں کی خاطر مدارات کا اہتمام اس کے سپرد ہے۔

غالب ~ کہا، میں صید ہوں اس کا کہ جس کے دامِ گیسو میں
پھنسا کرتے ہیں طائر روز آکر باغِ رضواں سے

دستِ موسیٰ

دستِ موسیٰ کی تلمیح حضرت موسیٰؑ کے معجزۂ یدِ بیضا کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ حضرت موسیٰؑ کے زمانۂ طفولیت میں ایک بار فرعونِ مصر نے آپ کا امتحان لیا تھا۔ ایک طشت میں

کھجوریں اور دوسرے طشت میں دہکتے ہوئے انگارے رکھ کر حضرت موسیٰؑ کے سامنے دونوں طشت لاکر پیش کیے۔ حضرت موسیٰؑ نے حکمِ الٰہی پر اظہارِ معصومیتِ طفل کے طور پر انگارے اٹھاکر منھ میں رکھ لیے، جس کی وجہ سے زبان میں جلنے سے لکنت آگئی اور ہتھیلی پر آگ کا سفید داغ پڑ گیا۔ اس سفید داغ کو اللہ تعالیٰ نے معجزۂ یدِ بیضا میں تبدیل کردیا تھا۔ اس زمانے میں سحر و جادو کا مصر میں بہت رواج تھا، اس لیے ایسے معجزے کی ضرورت تھی جس کی طاقت سحر و جادو اور بشری دسترس سے باہر ہو۔ دستِ موسیٰؑ کا معجزہ یہ تھا کہ حضرت موسیٰؑ جب بھی اپنے ہاتھ کو گریبان کے اندر بغل سے مَس کرکے باہر نکالتے تو اُن کی ہتھیلی آفتاب کی مانند چمکنے لگتی تھی اور پیغامِ حق کے لیے دلیل و حجّت کا کام دیتی تھی۔

غالب ؎ حسنِ آشفتگیٔ جلوہ، ہے عرضِ اعجاز
دستِ موسیٰ بسرِ دعویٔ باطل باندھا

جبریل

جبریل عبرانی لفظ ہے اس کے معنی ہیں مردِ خدا۔ اصطلاحِ شریعتِ اسلامی کے مطابق یہ سرخیلِ ملائکہ ہیں اور ان چار مقرب ترین فرشتوں میں سے ایک ہیں جن کے سپرد مخصوص کام ہیں۔ قرآن مجید میں ان کا یہ نام دو بار سورۂ بقر میں اور ایک بار سورۂ تحریم میں آیا ہے لیکن ان کی صفات کا ذکر متعدد صورتوں میں کیا گیا ہے۔

جبریل کا کام خدا اور خاصانِ خدا کے درمیان پیامبری کا ہے۔ انھوں نے ہی حضرت

آدمؑ کو ابجد کی تعلیم دی تھی اور کھیتی باڑی کا طریقہ سکھایا تھا۔ حضرت نوحؑ کو کشتی بنانے کا طریقہ بتانے والے بھی یہی تھے۔ عبورِ قلزم کے وقت حضرت موسیٰؑ اور فرعون کے درمیان جبریلؑ ہی کھڑے ہو گئے تھے۔ وادی غیر ذی زرع میں حضرت حاجرہ نے ان کی آواز سنی تھی اور پردۂ زمین چاک کر کے چشمۂ زمزم جاری کرنے والے بھی جبریلؑ تھے۔ اِنھوں نے حضرت مریم کو حضرت عیسیٰؑ کی بشارت دی تھی۔ آنحضرت صلعم کا سینۂ مبارک چاک کر کے اس کو ایمان و حکمت سے مزیّن کرنے والے بھی جبریلؑ تھے۔

جبریلؑ کے بہت سے وصفی نام مشہور ہیں جیسے روح الامین[1]، روح القدس[2]، طائرِ قدس، ناموسِ اکبر[3]، عقلِ کل، جوہرِ اوّل[4]، سدرہ نشین، طائر و بلبلِ سدرہ اور مرغِ عرشی[5] وغیرہ۔

غالبؔ ؎

شعلہ تحریر سے اس برق کی ہے کلکِ قضا
بالِ جبریل سے مسطر کشِ سطرِ زنہار

---

1. روح الامین بمعنی امانت دار روح۔ یہ لقب قرآن مجید کی سورۂ شعرا میں دیا گیا ہے۔
2. روحُ القدس افضل اور برتر روح کے معنی میں سورۂ نحل میں آیا ہے۔ عیسائیوں میں اقانیمِ ثلاثہ میں شمولیت کی وجہ سے یہ نام ہے۔
3. اسرارِ الٰہی کا سب سے بڑا رازدار ہونے کی وجہ سے یہ نام ہے۔ آنحضرت صلعم پر پہلی بار نزولِ وحی کے موقع پر ورقہ بن نوفل نے ان کو ناموس کہہ کر تصدیق کی تھی۔ غالبؔ ؎

روح القدس اگرچہ مرا ہم زباں نہیں
پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کلام کی

4. عقولِ عشرہ میں شامل ہونے کی وجہ سے اِن کو عقلِ اوّل، عقلِ کل اور جوہرِ اول کہا جاتا ہے۔ حکمائے یونان کے نزدیک جبریلؑ نے تخلیق کائنات سے قبل ایک فرشتہ اور ایک آسمان بنایا تھا۔ اس فرشتہ نے تیسرا فرشتہ اور دوسرا آسمان بنایا۔ اسی طرح دس فرشتے اور نو آسمان پیدا ہو گئے۔
5. سِدرۃُ المنتہیٰ یعنی انتہا کی بیری پر قیام کی وجہ سے سدرہ نشین اور مرغِ عرشی وغیرہ کہا جاتا ہے۔

جَلوۂ طُور

جلوۂ طور سے مراد تجلّی باری تعالیٰ ہے جس کی تاب نہ لاکر حضرت موسیٰؑ کوہ طور پر بیہوش ہو کر گر گئے تھے۔ حضرت موسیٰؑ نے ایک بار باری تعالیٰ سے اِن الفاظ میں درخواست کی تھی۔ "رَبِّ اَرِنِیْ اَنْظُرْ اِلَیْکَ" یعنی "پروردگار تو مجھے اپنے کو دکھا تاکہ میں تیری طرف نظر کرسکوں"۔ اس کا یہ جواب ملا تھا۔ "لَنْ تَرٰنِیْ وَلٰکِنِ انْظُرْ اِلَی الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَکَانَہٗ فَسَوْفَ تَرٰنِیْ فَلَمَّا تَجَلّٰی رَبُّہٗ"۔ یعنی "تم ہرگز نہ دیکھ سکوگے۔ ہم اپنی تجلّی کا ظہور اس پہاڑ (کوہ طور) پر کریں گے اگر اس نے تجلّی کو برداشت کرلیا تو تم بھی مجھے دیکھ سکوگے"۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنی تجلّی کا ظہور پہاڑ پر کیا تو وہ ریزہ ریزہ ہو کر سرمہ سیاہ بن گیا۔ حضرت موسیٰؑ تجلّی کو برداشت نہ کرسکے اور بیہوش ہو کر گر پڑے۔

اس واقعہ کے لیے تجلّی، تجلّی طور، برقِ تجلّی، برقِ طور، جلوۂ طور، جلوۂ ایمن، جلوہ سینا، جلوہ باری اور لن ترانی کی تلمیحات بھی مستعمل ہیں۔

غالبؔ ؎

گردِ جولاں سے ہے تیری، بگریبان خرام
جلوہ طور، نمک سُودۂ زخمِ تکرار

نَلْ دَمَنْ

نل دمن کا افسانہ محبت مہابھارت کا ایک ضمنی قصہ ہے۔ علامہ فیضی نے مثنوی کی

صورت میں اس قصہّ کو نظم کیا ہے، یہی مثنوی اس قصہّ کی شہرت کا اصل سبب بنی ہے۔ اب یہ قصہّ بھی لیلیٰ مجنوں کی مانند مشہور ہے۔

نل نشادھ دیس کا راجہ تھا۔ یہ بہادر، خوب صورت اور باہمت انسان ویدوں کا بھی عالم مانا جاتا تھا۔ دمن یعنی دمینتی ودھرب دیس کے راجہ بھیم کی اکلوتی لڑکی تھی۔ وہ انتہائی حسین اور نازک مزاج تھی۔ نل اور دمن ایک دوسرے کی شہرت سن کر نادیدہ طور پر عشق کرنے لگے تھے حالاں کہ دونوں کی ملاقات کبھی نہ ہوئی تھی۔ دمینتی جب شادی کے قابل ہوئی تو راجہ بھیم نے سوئمبر کی تیاری کی۔ اس سوئمبر میں راجہ نل کے علاوہ چار دیوتا نل کی صورت بنا کر شامل ہوئے تھے۔ دمینتی نے نل کا ہی انتخاب کیا اور دونوں کی شادی ہو گئی۔ نل کا چھوٹا بھائی پُشکر بہت حاسد اور بد طینت تھا۔ اس نے نل کے ساتھ ایک بار جُوا کھیلا اور بد دیانتی کر کے دمینتی، اس کے دونوں بچوّں اور ساتھ میں سلطنت کو بھی نل سے جیت لیا۔ پُشکر نے سلطنت پر قبضہ کر کے نل، دمن اور بچوّں کو یہ اعلان کرتے ہوئے چھوڑ دیا کہ ان لوگوں کی کوئی مدد نہ کرے۔ ایک عرصے تک یہ خاندان جنگلوں میں مارا مارا پھرتا رہا۔ جب لوگوں کے مصائب حد سے بڑھ گئے تو ایک دن دمینتی کو اکیلا چھوڑ کر نل غائب ہو گیا۔ اُس کا مقصد یہ تھا کہ دمینتی اس کے ساتھ اب مزید تکلیفیں نہ اٹھائے اور اپنے گھر چلی جائے۔ دمینتی جب سو کر اٹھی تو اس نے نل کو تلاش کیا اور جب مایوس ہو گئی تو اپنے گھر نہ گئی بلکہ راجہ چھیدی کے یہاں جا کر پناہ گزیں ہوئی۔ راجہ چھیدی نے کہہ سن کر دمینتی کو اس کے باپ کے گھر بھجوا دیا۔ دوسری طرف نل کو سانپ نے کاٹ لیا۔ اس کے زہر سے نل کا قد بھی کوتاہ ہو گیا اور اس کی صورت بھی بدل گئی۔ اِسی حالت میں نل نے اجودھیا کے راجہ رِتو کرن کے یہاں باہک کے فرضی نام سے ملازمت کر لی اور اپنی زندگی کے دن گزارنے لگا۔ دمینتی کے باپ نے نل کو بہت تلاش کرایا لیکن اس کو صورت کی تبدیلی کی وجہ سے کوئی بھی نہ پہچان سکا۔ دمینتی کے باپ کو نل کی زندگی کی طرف سے اطمینان تھا کیونکہ اس کو

ایک برہمن نے بتایا تھا کہ نل زندہ ہے۔ دمینتی اسی امید پر اپنی زندگی گزار رہی تھی۔ دمینتی کے باپ نے برہمن کی صداقت کا امتحان لینے کے لیے دمینتی کا سوئمبر دوبارہ کیا۔ اس کو امید تھی کہ اگر نل زندہ ہے تو سوئمبر میں ضرور شریک ہوگا۔ جب سوئمبر ہوا تو اس میں راجہ پرتو کرن بھی شامل ہوا۔ اس کے رتھ کو ہانکنے والا کوئی اور نہیں بلکہ نل ہی تھا۔ سوئمبر میں دمینتی نے نل کو کچھ کچھ پہچانا لیکن پورا یقین نہیں آیا۔ دمینتی نے پہچاننے کے لیے نل سے کھانا پکوایا اور جب اس کے ہاتھ کا کھانا کھایا تو پورا یقین ہو گیا کہ وہ نل کے علاوہ دوسرا کوئی نہیں ہے۔ دیوتاؤں کی مدد سے نل کی بدصورتی بھی دور ہو گئی۔ اپنی بیوی بچوں کو پانے کے بعد نل نے پشکر سے دوبارہ جوا کھیلا۔ اس بار جوے کی بازی میں اس نے نہ صرف سلطنت واپس لے لی بلکہ پشکر کے بیوی بچوں کو بھی جیت لیا۔ پشکر نے ہاتھ جوڑ کر بڑے بھائی سے معافی مانگی۔ نل نے اس کو گلے سے لگا کر سارے گلے شکوے دور کیے اور دل سے معاف کر دیا۔

غالب ؎

ہوا ہے کاٹ کے چادر کو ناگہاں غائب
اگرچہ زانوئے نل پر رکھے دمن تکیہ

اعجازِ مسیح

"مسیح" اور "مسیحا" دونوں حضرت عیسیٰ ؑ کے لقب ہیں۔ مسیح کے معنی مبارک و مسعود اور ایسے سیاح کے ہیں جس کا کوئی گھر نہ ہو۔ یہ تمام خصائص حضرت عیسیٰ ؑ میں موجود

تھے۔ اس کے علاوہ مسیح سے مراد مسح کیا گیا بھی ہے۔ حضرت عیسیٰؑ جب پیدا ہوئے تھے تو آپ کے سر مبارک پر فرشتوں نے تیل کی مالش کی تھی، اس لیے بھی یہ لقب ہوا ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم کو 'مسیح' کی بشارت دی تھی۔ حضرت عیسیٰؑ کو اللہ تعالیٰ نے حیات بخشی کا معجزہ عطا فرمایا تھا۔ 'اعجازِ مسیح' کی تلمیح بھی اس معجزے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اردو میں 'مسیح اور مسیحا' کا استعمال بھی عام طور پر جاں بخشی کے مفہوم میں ہوتا ہے۔

غالبؔ ؎

قبلۂ نورِ نظر، کعبۂ اعجازِ مسیح
مژۂ دیدۂ نخچیر سے فیضِ بیمار

حضرت عیسیٰؑ 'قُم باذن اللہ' کہہ کر مُردوں کو زندہ کر دیتے تھے۔ وہ پیدائشی نابینا کو بینا اور جذامی کو صحت مند کر دیتے تھے۔ لبِ عیسیٰؑ کی تلمیح ان معنوں میں ہی استعمال ہوتی ہے۔ علاج معالجے اور اکتسابی تدابیر سے مایوس ہو کر مریض آپ کے پاس آتے تھے اور جنبش لب کی تاثیرِ صحت بخشی سے شفا پا کر شاداں و فرحاں اپنے گھروں کو واپس ہوتے تھے۔

غالبؔ ؎

لو ہم مریضِ عشق کے، تیماردار ہیں
اچھا اگر نہ ہو، تو مسیحا کا کیا علاج

غالبؔ ؎

لبِ عیسیٰ کی جنبش کرتی ہے گہوارہ جنبانی
قیامت، کشتۂ لعلِ بتاں کا خوابِ سنگیں ہے

حضرت عیسیٰؑ مٹی کے پرند بنا کر اس پر دم کر دیتے تھے۔ خدا کے حکم پر اُن پرندوں میں روح پڑ جاتی تھی۔ اکثر شعرا نے ان معنوں میں دمِ عیسیٰ کی تلمیح کو استعمال کیا ہے۔ مشہور ہے کہ چمگادڑ (خفاش) پرند حضرت عیسیٰؑ کی تخلیق ہے اسی لیے چمگادڑ کو مرغِ عیسیٰ بھی کہا جاتا ہے[1]۔

---

[1] مرغِ عیسیٰ (چمگادڑ) کو حضرت عیسیٰؑ کی تخلیق بتایا جاتا ہے۔ انسانی بھول چوک کا اندازہ اس پرندے سے ہی ہوتا ہے کیونکہ اس میں بہت سی باتیں دوسرے (باقی آئندہ صفحہ پر)

غالبؔ ؎ مر گیا صدمۂ یک جنبش لب سے غالبؔ
نا توانی ہیں حریفِ دمِ عیسیٰ[1] نہ ہوا

عشق و مزدوری عشرت گہ خسرو

اس تلمیح کا تعلق خسرو پرویز کی بیوی شیریں سے فرہاد کے عشق اور اس سلسلہ میں بیستون کی کوہکنی سے ہے۔ ان دونوں کی داستانِ محبت اردو و فارسی کی رزمیہ کہانیوں اور عشقیہ قصوں کا ایک مقبول عام موضوع ہے۔ فرہاد نے اپنی محبوبہ شیریں کی خاطر کوہِ بیستون تراش کر خسرو پرویز کے محل تک ایک نہر نکالی تھی جس کے ذریعہ محل تک بکری کا تازہ دودھ پہنچنے میں آسانی ہوگئی تھی۔

غالبؔ ؎ عشق و مزدوری عشرت گہ خسرو کیا خوب
ہم کو تسلیم نکو نامیٔ فرہاد نہیں

خسرو پرویز کی محبوبہ اور بیوی کا نام شیریں تھا۔ یہ مہین بانو[1] کی بیٹی تھی۔ اس کے

(گذشتہ سے پیوستہ)

پرندوں سے مختلف ہیں۔ یہ پرند منہ سے رفع حاجت کرتا ہے۔ اس کے چار پاؤں ہوتے ہیں۔ اس کی مادہ کو حیض آتا ہے اور وہ اپنے بچوں کو دودھ پلاتی ہے۔ یہ پرند شب کو بینا اور دن کو نابینا ہو جاتا ہے۔

[1] ملک ارم کی ملکہ کا نام۔

کہنے پر ہی خسرو نے بہرام چوبیں کو شکست دے کر اپنے موروثی ملک مدائن پر دوبارہ قبضہ کیا تھا۔ مہین بانو کے انتقال کے بعد شیریں اپنے محبوب کے حرم میں تو آگئی تھی لیکن اِن دونوں کی شادی مدّت تک نہ ہو سکی۔ جب خسرو کی بیوی مریم (قیصرِ روم کی لڑکی) کا انتقال ہو گیا تو شیریں اس کی جگہ لے سکی تھی۔ دونوں کی شادی شریعتِ زرتشتی کے مطابق بہت دھوم دھام سے ہوئی اور دونوں عاشق و معشوق ایک جان دو قالب ہو کر زندگی گزارنے لگے۔ شیریں کو بکری کے تازہ دودھ سے بہت زیادہ رغبت تھی لیکن اس کے محل تک دودھ آتے آتے باسی ہو جاتا تھا۔ کوہ بیستون کو تراش کر اگر نہر نکال لی جاتی تو تازہ دودھ کی دستیابی ممکن تھی۔ یہ بات خواب و خیال کی تھی کیوں کہ بیستون کافی سخت اور بلند ترین پہاڑ خیال کیا جاتا تھا۔ اسی زمانہ میں ایران کا مشہور سنگ تراش فرہاد شیریں پر فریفتہ ہو گیا اور اس کے عشق کا چرچا ملک بھر میں پھیلنے لگا۔ خسرو نے فرہاد سے پیچھا چھڑانے کے لیے یہ شرط رکھی کہ اگر وہ بیستون سے دودھ کی نہر نکال لیتا ہے تو شیریں اس کو بخش دی جائے گی۔ بظاہر یہ ایک امرِ محال تھا۔ خسرو یہ جانتا تھا کہ ایفائے وعدہ کا کبھی بھی موقعہ نہ آئے گا۔ اگر فرہاد کامیاب ہو گیا تو اس کا ایک دیرینہ خواب پورا ہو جائے گا۔

غالبؔ ؎
ہو سکے کیا خاک، دست و بازوئے فرہاد سے
بیستون، خوابِ گرانِ خسروِ پرویز ہے

بیستون کاٹ کر نہر نکالنا آسان کام نہ تھا لیکن فرہاد ایک امیدِ موہوم پر کوہکنی کے کام میں مشغول ہو گیا۔ عشق کی لگن اور تصوّرِ وصالِ محبوب میں کمرِ ہمت باندھ کر کوہ بیستون کے پتھر کاٹنے لگا۔ بلعمی نے لکھا ہے کہ پتھر کا ایک ٹکڑا جو وہ کاٹتا تھا اس کا وزن اتنا ہوتا تھا کہ سَو آدمی بھی اس کو جنبش نہ دے سکیں۔ اسی طرح سالہا سال گزر گئے۔

غالبؔ ؎
کاوِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

فرہاد نے بیستون پر جگہ جگہ شیریں کے مجسمے تراش لیے تھے، ان کو دیکھ کر اپنا دل بہلا لیتا تھا اور شیریں کے حصول کے شگون لیتا تھا۔ اسی لیے اس کو کوہکن بھی کہا جاتا ہے۔

غالبؔ ؎
کوہکن نقاش یک تمثالِ شیریں تھا اسدؔ
سنگ سے سر مار کے ہووے نہ پیدا آشنا

کوہِ بیستون کے پتھروں کی سختی فرہاد کی لگن میں حارج نہ ہو سکی اور اس نے سبکدستی کے ساتھ پہاڑ تراش کر جوئے شیر نکال لی۔

غالبؔ ؎
تکلف برطرف، فرہاد اور اتنی سبکدستی
خیال آساں تھا لیکن خوابِ خسرو نے گرانی کی

اب ایفائے وعدہ کا وقت آ گیا تھا لیکن خسرو کو شیریں کی مفارقت کسی طرح گوارا نہ تھی۔ اس نے عیاری سے کام لیا۔ اپنے ایک مصاحب کو بوڑھی عورت کا بھیس بدلوا کر فرہاد کے پاس بھیجا اور یہ کہلوایا کہ شیریں مر چکی ہے۔ اس بوڑھی عورت کے لیے ادب میں پیرزن کی تلمیح مستعمل ہے۔

غالبؔ ؎
دی سادگی سے جان پڑوں کوہکن کے پانو
ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پانو

فرہاد نے جب یہ جھوٹی اور روح فرسا خبر سنی تو اسے سکتہ سا ہو گیا۔ اس نے عالمِ وارفتگی میں تین بار شیریں کا نام لے کر اپنے سر پر وہی تیشہ مار لیا جس سے پتھر کاٹ کر جوئے شیر نکالی تھی اور آخر کار جانِ شیریں، شیریں پر نچھاور کر دی۔

غالبؔ ؎
تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ
سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

غالبؔ ؎
سعیِ عاشق ہے فروغ افزائے آبروئے کار
ہے شرارِ تیشہ، بہرِ تربتِ فرہاد گل

کعبہ

کعبہ کے لغوی معنی بلندی اور سطح مرتفع کے ہیں۔ بیت اللہ کو کعبہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کی سطح مرتفع ہے یا از روے مراتب رفیع اور عظیم الشان ہے۔ تمام عالم کے مسلمان اس کی طرف مُنھ کر کے نماز پڑھتے ہیں اور ہر سال ۱۰ ذی الحجہ کو یہاں جمع ہو کر اس کا طواف کرتے ہیں۔

مشہور ہے کہ کعبہ کی اساس حضرت آدم نے رکھی تھی لیکن قرآن مجید نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔ قرآن مجید کے مطابق کعبے کی تعمیر کا کام حضرت ابراہیمؑ اور ان کے عالی مرتبت بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ کے مبارک ہاتھوں سے پورا ہوا تھا۔ یہ خدا کا پہلا گھر ہے جو خدا پرستی کے معبد و مرکز کی حیثیت سے تمام جہان والوں کے لیے سرتاپا برکت ہے۔

آنحضرت صلعم کی بعثت تک یہ معبدِ اعظم مشرکین کے قبضہ میں تھا اور اس میں تین سو ساٹھ بُت رکھے ہوئے تھے۔ یہ سب پتھر کی مورتیاں نہ تھیں بلکہ ان میں سے کچھ تصاویر بھی تھیں۔ سال کے ہر دن کے واسطے ایک بُت عبادت کے لیے مخصوص تھا یا عرب کے تمام قبیلوں اور جُدا جُدا قوموں کے یہ بُت تھے۔

فتح مکہ (۱۰ رمضان المبارک ۸ھ ہجری) کے دن جب آنحضرت صلعم نے ان بتوں کو کعبہ سے دور کیا تو آپ کی زبان مبارک پر یہ آیۂ کریمہ تھی:

جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ط اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ط

غالب ؎

گر واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں
کعبہ سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دُور کی

غالبؔ ؎ کعبہ کس مُنھ سے جاؤگے غالبؔ
شرم تم کو مگر نہیں آتی

غالبؔ ؎ بہ شیخ جی کعبہ کا جانا، معلوم
آپ مسجد میں گدھا باندھتے ہیں

چراغانِ دِوالی

دِوالی ہندوستان کا مشہور تہوار ہے جو جشنِ چراغاں کی وجہ سے "دیپ والی" کے نام شہرت رکھتا ہے۔ یہ تہوار کارتک کی پندرہ تاریخ کو منایا جاتا ہے۔ اس دن آفتاب اور ماہتاب کا بُرجِ میزان میں اجتماع ہوتا ہے۔ لوگ غسل و آرائش کرکے لکشمی دیوی کی پوجا کرتے ہیں۔ یہ قسمت اور دولت کی دیوی ہے۔ اس دن کو 'یوم بل راج' بھی کہا جاتا ہے، کیوں کہ اسی دن لکشمی بیروجن کے بیٹے بَل کو پاتال کی قید سے چھڑاتی ہے۔ راجہ بَل چونکہ خیر د نیکی کے زمانہ ست یُگ میں تھا اسی لیے خوشی کا اظہار کیا جاتا ہے۔

غالبؔ ؎ ہے تماشا گاہِ سوزِ ناز، ہر یک عضوِ تن
جوں چراغانِ دِوالی صف بہ صف جلتا ہوں میں

کوچۂ زُنّار

کوچۂ زُنّار سے مراد مقامِ کفر ہے۔ زنّار آرامی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے معنی پیٹی و پٹکے کے ہیں جسے راہب اور درویش لوگ اپنی کمر کے گِرد باندھ لیتے ہیں۔ قدیم عربی میں زنّار عبا پر باندھنے والی پیٹی کو کہا جاتا ہے جس کو یہودی، عیسائی، مجوسی اور ذِمّی لوگ استعمال کرتے تھے۔ جدید عربی میں بالوں کی لٹ کے لیے یہ لفظ مستعمل ہے جس کو پیشانی پر جمایا جاتا ہے۔

فارسی میں زنّار، دھاگے کے بٹے ہوئے نَو تاروں کو کہا جاتا ہے جن کو اہلِ ہند بائیں کاندھے پر داہنی بغل کے نیچے سے نکال کر پہنتے ہیں۔ اس کو ذریعہ طہارت بھی سمجھا جاتا ہے۔ برہمنوں کے لیے زنّار پوشی لازمی ہے۔ ان کے علاوہ دوسری ذات کے لوگ اگر زنّار پہنیں تو اس کے تاروں کی تعداد کم ہوتی ہے۔

غالبؔ ؎

یہ ہوائے چمنِ جلوہ، ہے طاؤس پرست
باندھے ہے پیرِ فلک موجِ شفق سے زنّار

غالبؔ ؎

بسکہ ویرانی سے کفر و دیں ہوئے زیر و زبر
گردِ صحرائے حرم تا کوچۂ زنّار ہے

زُلیخا و یُوسُفؑ

عزیزِ مصر، فوطیفار کی حسین و جمیل بیوی کا نام زلیخا[1] تھا۔ یہ عشقِ یوسف کی وجہ سے

---

[1] زلیخا کا تلفظ بضمِ اول و فتحِ لام بروزن شُوہدا صحیح ہے اور بفتحِ اوّل و کسرِ دوم بروزن چلیپا غلط ہے۔

دنیا میں رسوا ہوئی ہے۔ حضرت یوسفؑ بنی اسرائیل کے جلیل القدر پیغمبر، حضرت یعقوبؑ کے بیٹے اور حضرت ابراہیمؑ کے پوتے تھے قرآن مجید نے ان کے قصّہ کو تفصیل سے بیان کیا ہے اور "احسن القصص" قرار دیا ہے۔ عزیزِ مصر نے حضرت یوسفؑ کو مصر کے بازار سے نیلامی میں خریدا تھا۔ اُس نے اولاد کی مانند حضرت یوسفؑ کو سمجھا اور اپنے گھر کا سارا انتظام اِن کے سپرد کر کے مختارِ کل بنا دیا تھا۔ حضرت یوسفؑ مردانہ حسن و جمال کا پیکرِ مجسّم تھے۔ اُن کو دیکھ کر زلیخا اپنا دل قابو میں نہ رکھ سکی اور دیوانہ وار ان کے عشق میں مبتلا ہوگئی۔

غالبؔ ~ تھا خواب میں کیا جلوہ پرستارِ زلیخا
ہے بالشِ دل سوختگاں میں پرِ طاؤس

حضرت یوسفؑ نے زلیخا کی طرف کبھی التفات نہ کیا۔ دوسری طرف زلیخا اپنے ناپاک عزائم کو پورا کرنے کے خواب دن رات دیکھتی تھی اور طرح طرح سے حضرت یوسفؑ کو گناہ کے لیے ورغلاتی تھی۔

غالبؔ ~ ابھی آتی ہے بُو، بالش سے اس کی زلفِ مشکیں کی
ہماری دید کو خواب زلیخا عارِ بستر ہے

حضرت یوسفؑ کے عشق میں زلیخا کی بڑی فضیحت و رسوائی ہوئی۔ شاہی خاندان اور عمائدین شہر کی عورتیں غلام سے عشق کرنے پر زلیخا کو طعنے دیتی تھیں اور اپنی ہم چشموں میں زلیخا کا مذاق اڑاتی تھیں۔ زلیخا کے کانوں تک جب یہ باتیں پہنچیں تو اس نے زنانِ مصر کی دعوت کا انتظام کیا۔ دسترخوان پر جب سب عورتیں جمع ہوگئیں تو ان کے ہاتھ میں ایک ایک ترنج اور اس کو کاٹنے کی چھری دے کر حضرت یوسفؑ کو سب کے روبرو بُلالیا۔ حضرت یوسفؑ کا حسن و جمال تو بے پناہ تھا۔ ان کا چہرۂ زیبا شمس و قمر کی مانند تاباں و درخشاں تھا۔ زنانِ مصر اُن کو دیکھ کر اس درجہ مبہوت ہوگئیں کہ انہوں نے ترنج کاٹنے کی جگہ اپنی اپنی انگلیاں زخمی کرلیں۔ سب عورتوں نے یک زبان ہو کر جمالِ یوسف کی

لہ "بوئے یوسف" کی تلمیح بھی دیکھیے۔

تعریف اور توصیف کی جس کو سُن کر زلیخا بہت خوش ہوئی۔

غالب ؎ سب رقیبوں سے ہوں ناخوش، پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محو ماہ کنعاں ہو گئیں

(ماہِ کنعاں حضرت یوسفؑ کو کہا جاتا ہے کیوں کہ آپ کا وطن موضع کنعان تھا)

ایک دن موقع پاکر زلیخا نے حضرت یوسفؑ کو بلاکر کمرہ بند کر لیا اور اصرارِ گناہ کرنے لگی۔ حضرت یوسفؑ کے لیے یہ مرحلہ بڑا سخت تھا۔ شاہی خاندان کی حسین وجمیل نازنین، جو خود بھی شعلۂ حسن سے لالہ رو اور حسن و زینت کا مکمل نمونہ تھی، عشوہ طرازیوں کی بارش کر رہی تھی۔ دوسری طرف یوسف بھی جوان تھے لیکن وہ ایک لمحہ کے لیے بھی جذبات سے متزلزل نہ ہوئے اور انھوں نے ناپاک عشق سے صاف انکار کر دیا۔ حضرت یوسفؑ کو جیسے ہی موقع ملا وہ دروازہ کی طرف بھاگے۔ زلیخا نے ان کا پیچھا کیا اور دوڑتے میں پیراہن یوسف پیچھے سے چاک کر دیا۔ کسی نہ کسی طرح دروازہ کھول کر حضرت یوسف باہر نکلے تو دیکھا کہ سامنے ہی عزیز مصر کھڑا ہے۔ اس کے ساتھ زلیخا کا چچیرا بھائی بھی موجود ہے۔ ان دونوں نے حیرت کے ساتھ اس عجیب منظر کو دیکھا۔ زلیخا عورت بھی تھی اس نے اپنی فطری عیاری سے کام لے کر سارا الزام حضرت یوسفؑ پر رکھ دیا کہ اس شخص کا ارادۂ بد تھا۔ زلیخا کا چچیرا بھائی ہوشیار اور عقل مند تھا اس نے کہا کہ اگر یوسف کا دامن آگے سے چاک ہو تو یوسف خطاوار ہے اور اگر دامن پیچھے سے چاک ہے تو یوسف بے گناہ ہے۔ پیراہن یوسف دیکھا گیا تو وہ پیچھے سے چاک تھا۔ عزیز مصر کو یوسفؑ کی بے گناہی کا یقین ہو گیا۔ لیکن اپنی رسوائی و فضیحت کے خوف سے ان کو زنداں میں ڈال دیا۔ ایک معصوم کو مجرم بنا دیا۔ اس واقعہ کے لیے زندان یوسف، حجرۂ یوسف، پیراہن یوسف، حسن یوسف حسن کنعاں، خواب زلیخا، زنان مصر، مصر کا بازار، ترنج وانگشت، زلیخا کی جوانی اور بہت سی تلمیحات مستعمل ہیں۔

غالبؔ ؎ ہنوز اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار ہے باقی
دلِ افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا

سُلیماں کا نگیں

"سلیماں کا نگیں" سے مراد حضرت سلیمانؑ کی انگوٹھی ہے۔ مشہور ہے کہ اس انگوٹھی پر اسمِ اعظم کندہ تھا اور اس کی برکت سے انسانوں کے علاوہ جن و حیوانات بھی حضرت سلیمان کے تابع تھے لیکن قرآن مجید نے اس روایت کی تصدیق نہیں کی ہے۔ اس انگوٹھی سے متعلق بے شمار اسرائیلی روایتیں مشہور ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ایک بار شیطان نے اس انگوٹھی کو چرا کر بصورت سلیمان عرصہ تک بادشاہی کی تھی۔ جب حضرت سلیمانؑ کو وہ انگوٹھی واپس ملی تو سلطنت بھی شیطان سے دوبارہ حاصل کر سکے۔ ایسی بے سروپا روایتوں سے محتاط مفسرین نے ہمیشہ اپنا دامن بچایا ہے۔

غالبؔ ؎ بادِ افسانۂ بیمار ہے، عیسیٰ کا نفس
استخواں ریزۂ موراں ہے سلیماں کا نگیں

یہ ممکن ہے کہ اس انگوٹھی پر اسمِ اعظم کندہ ہو لیکن صرف یہ انگوٹھی حضرت سلیمانؑ کی حکومت کا سبب ہرگز نہ تھی۔ ان کی عظیم الشان سلطنت خدا نے عطا کی تھی اور خدا نے ہی اُن کے حق میں چرند، پرند، ہوا اور جن وغیرہ مسخّر کیے تھے۔ اُن کے وزیر کا نام آصف بن برخیا تھا۔ یہ بھی صاحب اسم اعظم تھا۔ قرآن مجید نے اشارہ کیا ہے کہ اس کے پاس

کتاب کا علم تھا۔

غالب ؎

آصف کو سلیماں کی وزارت سے شرف تھا
ہے فخرِ سلیماں جو کرے تیری وزارت

فرعونِ بے ساماں

فرعون شاہانِ مصر کا قدیم لقب ہے۔ اس کے معنی نہنگ کے ہیں اور فراعنہ اس کی جمع ہے۔ اردو میں عام طور پر فرعون سے مراد اس بادشاہ سے لی جاتی ہے جو حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں تھا۔ اسی لیے فرعون کے مجازی معنی سرکش، ظالم، متکبر اور نافرمان کے لیے جاتے ہیں۔ فرعونِ بے ساماں، بچھورے اور گھمنڈی انسان کے لیے آتا ہے جو مقدرت نہ ہونے پر بھی شیخی سے باز نہ آئے اور سرکشی کا دم بھرے۔

مصر کے بادشاہ خود کو مصر کے سورج دیوتا "آمن رع" کا اوتار سمجھتے تھے۔ راع کا اوتار ہونے کی وجہ سے ان کا نام 'فاراع' ہو گیا جو عبرانی میں 'فارعن' اور عربی میں آکر 'فرعون' بن گیا۔ فرعونوں کا خاندان شاہی نسل کے اعتبار سے عمالقہ[1] میں سے تھا۔ مصر کی

---

[1] فرعونوں کے اکتیس[31] خاندانوں نے مصر پر حکومت کی تھی۔ عمالقہ فراعنہ مصر کا انیسواں خاندان تھا۔ اسی خاندان سے فرعونِ موسیٰ تھا۔ ان فرعونوں کی مصر پر حکومت تین ہزار سال قبل مسیح سے شروع ہو کر عہد سکندر تک رہی تھی۔ سب سے آخری فرعون ۳۳۲ ق م میں سکندر کے ہاتھوں مفتوح ہوا تھا۔

تاریخ میں اس کو ہیکسوس کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔

حضرت موسیٰ کے ہمعصر فرعون کا نام جدید حجری کتبات کی تحقیق اور مصری اثریات کی چھان بین سے منفتاح معلوم ہوا ہے۔ یہ رعمسیس کا بیٹا تھا۔ اس فرعون کا دورِ حکومت ۱۲۹۲ ق م سے ۱۲۲۵ ق م تک بتایا جاتا ہے۔ فرعونِ موسیٰ کے لیے ہی "فرعونِ بے ساماں" تلمیح مستعمل ہے جو اس عظیم القدر بادشاہ کے عجز و بے چارگی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ ایک طرف تو وہ خدائی کا دعویدار تھا۔ اس کے حکم کے بغیر مصر میں پتّہ نہیں ہل سکتا تھا۔ دوسری طرف جب وہ بحرِ احمر میں مع اپنے لشکر کے غرق ہونے لگا تو اس نے بے کسی کے عالم میں کہا تھا "میں اُس خدا پر ایمان لاتا ہوں جو بنی اسرائیل کا ہے۔ میں اسی خدا کا بندہ ہوں۔" وہ دنیوی شوکت و سطوت، عزت و حکومت اور جاہ و جلال سب کچھ ختم کر چکا تھا۔ ایک بے بس اور مجبور بندہ اپنے اعمالِ بد پر پشیمانی کا اظہار کر رہا تھا لیکن رسی کی درازی ختم ہو چکی تھی۔ اس کی پکار کا جواب بارگاہِ الٰہی سے ملا۔ "آج کے دن ہم تیرے جسم کو ان لوگوں کے لیے جو تیرے پیچھے آنے والے ہیں نجات دیں گے تاکہ وہ (عبرت کا) نشان بنے۔" اس کے بعد فرعون مع لشکر کے غرق ہو گیا۔

خدائی فیصلہ کے مطابق اس فرعون کی لاش مصری عجائب خانہ میں نمائش کے لیے محفوظ ہے۔ اس فرعون کی ذلّت و رسوائی کو پوشیدہ رکھنے کے لیے مصر کے قدیم باشندوں نے بہت کوشش کی تھی۔ اس کی لاش کو اٹھارہویں خاندان کے فرعون 'امنحتب' کے مقبرہ میں رکھا تھا حالاں کہ مصری دستور کے مطابق ہر خاندان کا مقبرہ علیحدہ ہونا ضروری تھا۔ منفتاح کی لاش پھر بھی تلاش کر لی گئی۔ اس کی لاش کی ناک غائب ہے۔

غالبؔ ؎

اسدؔ یہ عجز و بے سامانیِ فرعونِ توام ہے
جسے تو بندگی کہتا ہے، دعوا ہے خدائی کا

تختِ سُلیمان

اورنگِ سلیماں یا تختِ سلیماں کی تلمیح شان و شوکت اور عظمت و جلال کے نشان کے طور پر مستعمل ہے۔ حضرت سلیمانؑ بنی اسرائیل کے مشہور پیغمبر تھے۔ نبوت اور بادشاہت دونوں چیزیں ان کو ورثہ میں ملی تھیں۔ اُن کی حکومت نہ صرف انسانوں پر تھی بلکہ چرند، پرند، جن و پری اور دوسری تمام مخلوق پر تھی۔ اس کے علاوہ ہوا بھی ان کے حق میں اللہ تعالیٰ نے مسخر کر دی تھی۔ آپ کا تخت اَجِنّہ کی مدد سے اُڑتا تھا اور مہینوں کی مسافت منٹوں میں پوری کر لیتا تھا۔ اس تخت کے لیے کسی انجن، مشین اور پٹرول جیسے ظاہری اسباب کی ضرورت نہ تھی بلکہ صرف حکم خدا پر ایک تیز رفتار ہوائی جہاز کی مانند سبک روی کے ساتھ دوشِ ہوا پر اڑتا تھا۔

غالب ~ اک کھیل ہے، اورنگِ سلیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے

بیضاوی نے تختِ سلیمان کے متعلق ایک اسرائیلی روایت بھی نقل کی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس تخت کو قومِ جن نے کاریگری سے بنایا تھا اور وہی اس کو اُڑاتی تھی۔ تخت کے نیچے دو زبردست اور خوں خوار شیر کھڑے رہتے تھے اور دو کَرگَس (گِدھ) اس پر موجود رہتے۔ حضرت سلیمانؑ جب اِس تخت پر سوار ہونا چاہتے تھے تو دونوں شیر اپنے پاؤں سمیٹ کر بیٹھ جاتے اور تخت نیچا ہو جاتا تھا۔ آپ جب سوار ہو جاتے تو دونوں شیر کھڑے ہو جاتے اور دونوں گِدھ اپنے پَروں کو پھیلا کر سرِ مبارک پر سایہ فگن ہو جاتے تھے۔

مُرغاب کے میدان میں ایک چبوترے کے کھنڈر اب بھی موجود ہیں۔ ان کو بھی تختِ سلیمان کہا جاتا ہے۔

غالب ~ جس جگہ ہو مسند آرا جانشینِ مصطفےٰ
اُس جگہ تختِ سلیماں نقشِ پائے مور ہے

نخلِ طور

وادی ایمن کے ایک مشہور درخت کو نخلِ طور کہا جاتا ہے۔ یہ کوہِ طور کے قریب تھا۔ حضرت موسیٰؑ کو سب سے پہلے اسی درخت پر نورِ الٰہی نظر آیا تھا۔ حضرت موسیٰؑ اپنے اہلِ وعیال کے ساتھ مصر واپس آرہے تھے کہ وادی ایمن سے اُن کا گزر ہوا۔ وہاں خنکی شدید تھی اس لیے آگ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ جب حضرت موسیٰؑ نے آگ کی تلاش میں دور تک نظر دوڑائی، تو ان کو بہت دور درخت پر ایک شعلہ سا چمکتا ہوا نظر پڑا۔ یہ شعلہ بھی عجیب تھا، نہ تو اس میں کوئی ارتعاش تھا اور نہ اس سے درخت کو کوئی نقصان پہنچ رہا تھا۔ حضرت موسیٰؑ نے جب اُس شعلہ کی یہ کیفیت دیکھی تو وہ خوف زدہ ہو کر واپس آنے لگے تو وہ آگ جو اُن کے آگے بڑھنے سے اب تک پیچھے ہٹ رہی تھی، اب قریب آگئی اور اُس میں سے آواز آئی "اے موسیٰ میں ہوں پروردگار جہانوں کا۔ پس تو اپنی جوتی اُتار دے۔ تو اس وقت طویٰ کی مقدس وادی میں کھڑا ہے۔ اور دیکھ! میں نے تجھے اپنی رسالت کے لیے چُن لیا ہے۔"

اُس کے بعد دیر تک حضرت موسیٰؑ کو اللہ تعالیٰ نے شرف ہمکلامی بخشا۔ معجزے عطا کیے اور بنی اسرائیل کی ہدایت کے واسطے مامور کیا۔ اُسی وقت سے یہ درخت دنیا میں

مشہور ہے۔ اس کو نخلِ ایمن، نخلِ موسیٰ، شجرِ ایمن، شجرِ طور، شجرِ کلیم بھی کہتے ہیں۔
حضرت موسیٰؑ کو بھی کلیم اور کلیم اللہ (خدا سے کلام کرنے والا) اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ
یہ سب سے پہلے نبی تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے اس شرف سے ممتاز فرمایا تھا۔

غالب ؎
بزمِ خوباں بسکہ جوشِ جلوہ سے پُرنور ہے
پشتِ دستِ عجز یاں ہر برگ نخلِ طور ہے

ہُدہُد و سُلیماں

حضرت سلیمانؑ کے نام کے ساتھ اکثر ہُدہُد (کھٹ بڑھئی) کا نام بھی آتا ہے۔
حضرت سلیمانؑ کو اللہ تعالیٰ نے بہت سے شرف بخشے تھے۔ آپ کے زیرِ نگیں انسانوں کے
علاوہ جن اور حیوانات بھی تھے۔ آپ تمام چرند و پرند کی بولیاں انسان ناطق کی گفتگو کی
مانند سمجھ لیتے تھے۔ آپ کے دربار میں تمام مخلوق حاضر رہتی تھی اور ہر ایک کے سپرد اس
کے لائق مخصوص کام تھا۔ اسی وجہ سے دربارِ سلیمانی مشہور ہے۔ اس دربار میں ہُدہُد کو
مخصوص مقام حاصل تھا۔ اس کے ذمہ لشکرِ سلیمانی کے لیے پانی کی تلاش کا کام تھا۔
ہُدہُد لشکر کے آگے آگے اُڑ کر پانی تلاش کر کے اس کی اطلاع دیتا تھا۔ یمن کی آفتاب پرست ملکہ بلقیس
کے حسن و جمال کی تعریف بیان کرنے والا بھی ہُدہُد تھا۔ حضرت سلیمانؑ نے اس کے جھوٹ و سچ
کا امتحان لینے کے لیے بلقیس ملکۂ سبا کو خط لکھا تھا۔ اس خط کو بھی ہُدہُد ملکِ سبا لے گیا
تھا۔ اس نسبت سے ہُدہُد کو قاصدِ سلیماں، پیکِ سلیماں، مرغِ سلیماں اور ہُدہُدِ سلیماں

کہا جاتا ہے۔ مصر میں اس کو ابن سلیمان (سلیمان کا بیٹا) بھی کہا جاتا ہے۔ مشہور ہے کہ ہُدہُد کا تاج پہلے سونے کا تھا اور لوگ سونے کے لالچ میں اس کو مار ڈالتے تھے۔ حضرت سلیمانؑ کی دعا سے اس کا تاج پَروں کا ہوا ہے۔

غالب ؎
غرورِ دستِ رَدِ نے شانہ توڑا فرقِ ہُدہُد پر
سلیمانی ہے ننگِ بے دماغانِ خود آرائی

اِنجیل

انجیل وہ الہامی کتاب ہے جو حضرت عیسیٰؑ پر نازل ہوئی تھی۔ شروع میں تو حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم کی اساس توریت تھی لیکن یہودیوں کی گمراہیوں، مذہبی بغاوتوں اور سرکشیوں کی وجہ سے توریت میں اصلاح کی ضرورت ہوئی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے توریت کے تکملہ کے طور پر انجیل عطا کی۔ اس وقت چار انجیلیں مستند سمجھی جاتی ہیں۔

۱۔ مَتیٰ کی انجیل: سب سے قدیم انجیل۔ مَتیٰ کا ترجمہ۔ اصل عبرانی انجیل اب ناپید ہے۔
۲۔ مَرقس کی انجیل: مَرقس حواری کی نگرانی میں تالیف ہوئی۔
۳۔ لُوقا کی انجیل: مَرقس کے بعد وجود پذیر ہوئی۔
۴۔ یُوحنا کی انجیل: حضرت عیسیٰؑ کے بارہ حواریوں میں سب سے مقدس حواری کی تالیف۔

انجیل میں حضرت عیسیٰؑ کی زندگی کے حالات درج ہیں۔ انجیل کے لغوی معنی مُژدہ اور خوش خبری کے ہیں۔

غالب ؎ مُدعا دَر پردہ یعنی جو کہوں باطل سمجھ
وہ فرنگی زادہ کھاتا ہے قسم انجیل کی

موجِ رُودِ نیل

رُود کے معنی ندی، نہر اور چشمہ کے ہیں۔ رُودِ نیل مصر کا مشہور دریا ہے جس کو مصر کا اَن داتا سمجھا جاتا ہے۔ اس دریا کی وادی میں مصر آباد ہے۔ اسی وجہ سے مصر کو نیل کا تحفہ یا نیل کی بیٹی کہا جاتا ہے۔ اگر یہ دریا اپنا راستہ بدل دے تو مصر ریگستان بن جائے گا۔ مصرِ قدیم کے لوگ اس کو اپنا معبود سمجھ کر اس کی پرستش کرتے تھے۔

رُودِ نیل سے بہت سی تاریخی داستانیں، پُراسرار کہانیاں، پیغمبروں کے قصے اور بنی اسرائیل کے واقعات وابستہ ہیں۔ یوسف و زلیخا کی داستانِ عشق، فرعونوں کا جاہ و جلال، ملکہ قلوپطرہ کی رنگین داستانیں، اہرام[1] اور ابوالہول[2] کے ہزارہا سال کے اسرار،

؎[1] زمانہ قدیم میں مصری بادشاہوں (فرعونوں) کی حنوط شدہ لاشیں رکھنے کے مقبرے اہرام کہلاتے ہیں۔ طوفانِ نوح کے بعد صرف اٹھارہ اہرام باقی رہ گئے تھے جو بعد میں توڑ پھوڑ دیے گئے۔ مشہور ہے کہ یہ اہرام بارہ ہزار سال قدیم ہیں یا ان میں سے بڑے اہرام کا سنگِ بنیاد حضرت ادریسؑ نے رکھا تھا۔ ان اہراموں کا ذکر جالینوس نے بھی اپنی تصانیف میں کیا ہے۔ ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے بڑا اہرام ساٹھ سال میں تیار ہوا تھا اور اس کو کیوپس بادشاہ مصر نے سنہ ۹۰۰ ق م میں بنوایا تھا۔ کیوپس کے اہرام کا مینار مثلث نما مخروطی ہے اور پتھر کی چٹانوں سے بنایا گیا ہے۔ یہ اہرام دو سو سنگی چبوتروں سے بنا ہے جس کے ہر چبوترے کی (باقی آئندہ صفحہ پر)

کوہ طور کی تجلی، یدِ بیضا اور اژدر موسیٰ کے معجزے۔ من و سلویٰ کی حلاوت اور بنی اسرائیل کی نادانیاں۔ غرضکہ اپنے سینہ میں مدفون ہزاروں واقعات لیے دریائے نیل آج بھی اسی روانی سے بہہ رہا ہے اور اس میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔

وادیٔ نیل کی دونوں جانب ایک تنگ اور لمبا حاشیہ ہے جسے دو پہاڑی سلسلوں نے صحرا سے الگ کر دیا ہے اسی کا نام مصر علیا ہے۔ نیل کی شاخوں میں جو آبادیاں بسی ہوئی ہیں ان کو نشیبی مصر کہا جاتا ہے۔ مصر کی تمام زرخیزی، سبزہ زار اور باغات صرف اسی دریا کے مرہونِ کرم ہیں۔

غالبؔ ؎ کی ہیں کس پانی سے یاں یعقوب نے آنکھیں سفید
ہے جو آبی پیراہن ہر موجِ رُودِ نیل کا

(گذشتہ سے پیوستہ) اونچائی چار فٹ آٹھ انچ ہے۔ اب مصر میں صرف تین اہرام باقی رہ گئے ہیں، جن میں سے بڑے اہرام کا نام "الہرمان" ہے (اہرام کا لفظ مفرد کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے)

۲؎ ابوالہول مصر کا قدیم سنگی مجسمہ ہے جس کو مصر کے قدیم باشندے اپنے خدا "ہارماچیس" کا نمائندہ سمجھتے تھے۔ اس مجسمہ کا سارا جسم زمین کے اندر ہے صرف سر اور دونوں ہاتھ باہر ہیں۔ اس کا سر عورت کا اور ہاتھ شیر کے ہیں۔ اس کے اعضا کی باہمی مناسبت سے اس کی اونچائی ۱۹ میٹر سے زیادہ بتائی جاتی ہے۔ پورا مجسمہ ایک چٹان سے تراش کر بنایا گیا ہے۔ اندازہ ہے کہ یہ چار پانچ ہزار برس قدیم ہے۔

۱؎ 'من و سلویٰ' اس غذا کو کہتے ہیں جو حضرت موسیٰ کی دعا سے ان کی قوم کے لیے آسمان سے اتری تھی۔ یہ حلوے کی مانند کوئی میٹھی چیز اور بٹیریں (پرندے) تھیں۔ بنی اسرائیل نے جب من و سلویٰ کھانے سے انکار کر دیا اور دوسرے مطالبات کیے تو بنی اسرائیل پر عتاب الٰہی نازل ہوا اور من و سلویٰ کا نزول بند ہو گیا۔

صُورِ اسرافیل

صُور کے لغوی معنی ترئی، قرنا اور نرسنگھا کے ہیں۔ زمانۂ قدیم میں بابلی، آرامی، کنعانی اور عبرانی قوموں میں شاہی جلال وجلوس اور اعلانِ جنگ کے لیے نرسنگھا پھونکنے کا رواج تھا۔ اس کو شاہی جلال کے اظہار اور غیر معمولی خطرہ کا پیش خیمہ سمجھا جاتا تھا۔

قرآن مجید میں صُور (نرسنگھا) کی اس خصوصیت کا ذکر متعدد صورتوں میں کیا گیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ قیامت کے دن ایک فرشتۂ مقرب، اسرافیل دوبار صُور پھونکے گا۔ پہلی آواز سے ساری کائنات نیست ونابود ہو جائے گی اور دوسری آواز سے سارے مُردے پھر جی اٹھیں گے۔ غرضکہ اس دن شہنشاہ مطلق کے اظہار جلال اور شدید خطرۂ حساب کا اعلان صُور پھونک کر ہوگا۔

غالبؔ ؎ پھونکتا ہے نالہ، ہر شب صورِ اسرافیل کی
ہم کو جلدی ہے مگر تو نے قیامت ڈھیل کی

(صُور کو عام طور پر مذکّر لکھا جاتا ہے لیکن مرزا غالبؔ نے اس شعر میں اس کو مونث باندھا ہے)

خامۂ مانی

خامۂ مانی کا اشارہ مشہور مصوّر اور نقاش مانی کے کِلک اور قلم کی طرف ہے۔ مانؔی کا

اصل نام "قوزلقیوس" تھا۔ یہ بابل کے ایک گاؤں میں حضرت عیسیٰؑ کے فوراً بعد پیدا ہوا تھا۔ اس کے زمانہ پیدائش میں اختلاف ہے۔ کوئی اسے اردشیر کا ہمعصر بتاتا ہے اور کسی کے نزدیک یہ بہرام شاہ بن ہُرمُز شاہ کے زمانہ میں پیدا ہوا تھا۔ یہ قدیم مصوّر فن نقاشی میں تلمیحاً مستعمل ہوتا ہے۔

مانی نے زرتشتی اور مسیحی مذہب کو امتزاج دے کر ایک نیا مذہب ایجاد کیا تھا جو فرقہ مالویہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی کتابوں میں شاپورگان، کنزالاحیاء اور سفرالجبارہ کو عالمگیر شہرہ حاصل ہو چکا ہے۔ مشہور ہے کہ مانی کی مصوّری اور نقاشی دراصل اس کی پیغمبری کا ایک معجزہ تھا جو اُس نے سفارت ربّانی کے ثبوت میں پیش کیا تھا۔ اب اس فن کی وجہ سے اس کا نام دنیا میں باقی ہے۔ مانی کا ارژنگ (فارسی میں ارتنگ یا ارژنگ) اردنگ کا مفرس ہے۔ اس کے معنی نگارخانہ کے ہیں۔ یہ اس کا مشہور نگارخانہ یا پکچر گیلری تھی۔ مشہور مصنّف ابوالمعالی کے نزدیک مانی کی کتاب التصاویر کا نام ارژنگ مانی تھا۔ صاحب روضۃ الصفا نے مانی کے سجائے ہوئے ایک غار کا نام ارژنگ قرار دیا ہے۔ پروفیسر الفرک کا کہنا ہے ارژنگ مانی درحقیقت مانی کی انجیل کا باتصویر نسخہ تھا۔ بہرحال مانی کے ساتھ اس کے ارژنگ کا نام بھی اکثر آتا ہے۔

غالبؔ ~~ زلف تحریر پریشانِ تقاضا ہے، مگر
شانہ ساں، مؤبہ زباں خامۂ مانی مانگے

اردو میں مانی سے متعلق بہت سی تلمیحات رائج ہیں جیسے مُرقّعِ مانی، نقش مانی اور ارژنگ مانی وغیرہ۔

غالبؔ ~~ کھینچے گر مانیٔ اندیشہ چمن کی تصویر
سبز، مثل خطِ نوخیز ہو، خط پرکار

مہ نخشب

مہ نخشب اس مصنوعی چاند کو کہتے ہیں جو شہر نخشب کو روشنی دینے کے لیے بنایا گیا تھا۔ شہر نخشب سمرقند سے دو فرسنگ کے فاصلہ پر آباد تھا۔ وہاں کے ایک مشہور حکیم ابن عطا المعروف بہ ابن مقنع نے اجزائے سیمابی کو ترتیب دے کر ایک مصنوعی چاند بنایا تھا۔ یہ چاند کوہِ سیام کے ایک کنویں سے طلوع ہو کر چار چار فرسنگ تک اصل چاند کی مانند روشنی دیتا تھا۔ صبح کے وقت پھر اسی کنویں میں غروب ہو جاتا تھا۔ اس چاند نے چار مہینے تک متواتر کام کیا پھر کسی وجہ سے اس کا نظام بگڑ گیا اور اس نے روشنی دینا بند کر دی۔

اس کنویں کو چاہ نخشب اور چاہ مقنع کہا جاتا ہے۔ اسی طرح اس چاند کو ماہ مقنع کی تلمیح سے بھی ظاہر کیا جاتا ہے۔ کوہ سیام سے طلوع و غروب کی نسبت سے اس کو ماہِ سیام بھی کہتے ہیں۔

غالب ؎ چھوڑا مہ نخشب کی طرح دستِ قضا نے
خورشید ہنوز اُس کے برابر نہ ہوا تھا

لیلیٰ مجنوں

مجنوں کے لغوی معنی سودائی اور دیوانہ کے ہیں اور لیلیٰ سیاہ فام کو کہتے ہیں۔

ادب میں یہ دونوں نام رسوائے زمانہ عاشق و معشوق کے لیے آتے ہیں۔ اِن دونوں کا عشق شہرت دوام کا حامل بن چکا ہے۔

مجنوں قیس بن عامری کا لقب تھا جو اپنے ہی قبیلہ کی ایک لڑکی لیلیٰ بنتِ سعد پر عاشق تھا۔ قیس کا باپ قبیلۂ عامر کا سردار تھا اور عرب کے سرداروں میں ممتاز حیثیت کا سمجھا جاتا تھا۔ لیلیٰ مجنوں کے فسانۂ محبت کو ابن خلدون، ابن خلکان اور ابن الکلبی جیسے مستند مورخین نے محض افسانوی ادب کی تخلیق قرار دیا ہے۔ فارسی ادب میں اِس قصّہ کو لانے والے مولانا نظامی گنجویؒ ہیں۔ اُن کا ایک خمسہ، جو کہ پانچ مثنویوں پر مشتمل ہے[1]، دنیائے ادب میں اہم مقام رکھتا ہے۔ اس خمسہ کی ایک مثنوی لیلیٰ مجنوں ہے۔ اُن کے علاوہ حضرت امیر خسروؒ، مولانا جامیؒ اور مکتبی شیرازی نے بھی اس قصّہ کو بصورت مثنوی نظم کیا ہے۔ اردو زبان میں نظیر اکبر آبادیؒ کا نام قابلِ ذکر ہے۔ مجنوں کی وفات کا سن ۸۰ھ ہجری بتایا جاتا ہے۔ لیکن لوگوں کو اس پر شبہ ہے کہ یہ وہی مجنوں ہے جو تاریخی حیثیت رکھتا ہے یا کوئی دوسرا ہے۔ ایک روایت میں مجنوں کو حضرت امام حسین کا دودھ شریک بھائی بھی ظاہر کیا گیا ہے، لیکن یہ روایت غلط ہے کیوں کہ وہ مجنوں قیس بن ذریح تھا۔ وہ بنی کعب کی ایک لڑکی لبنیٰ پر عاشق تھا۔ عام طور پر ان دونوں کے نام 'قیس و لبنیٰ' ساتھ ساتھ لیے جاتے ہیں۔ لیلیٰ کے متعلق یہ بھی روایت بیان کی جاتی ہے کہ وہ ۹۷ھ میں بنی امیہ کے عہد میں موجود تھی۔ اب کنایتہً ہر عاشق و معشوق کو لیلیٰ مجنوں کہا جاتا ہے۔

مشہور ہے کہ قیس بچپن سے ہی لیلیٰ پر عاشق تھا حالانکہ لیلیٰ کچھ گوری چٹی اور خوبصورت نہ تھی بلکہ برخلاف اِس کے سیاہ فام یا سانولی تھی۔ ان دونوں کے عشق کی جب عرب کے قبیلوں میں فضیحت و رسوائی ہونے لگی تو دونوں پر ملاقات کی پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ قیس اس قدغن کو برداشت نہ کر سکا اور وارفتگیٔ عشق میں جنون اور دیوانگی میں مبتلا ہو کر

---

[1] سن تصنیف ۵۸۴ھ ہجری

آوارہ گردی کرنے لگا۔ اس کے شہر اور قبیلہ کے لوگوں کو یقین کامل ہوگیا تھا کہ وہ دیوانہ ہوچکا ہے اور دیوانوں جیسا اس کے ساتھ سلوک بھی ہونے لگا۔

غالبؔ ؎
میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

مجنوں کی دیوانگی اور لیلیٰ پر پابندی دن بہ دن بڑھ رہی تھی۔ اسی عالم میں مجنوں نے صحرائے نجد کی خاک چھاننا شروع کردی۔

غالبؔ ؎
کس قدر خاک ہوا ہے دلِ مجنوں یارب
نقش ہر ذرّہ سویدائے بیاباں نکلا

لیلیٰ کے قبیلہ کا مسکن بھی وادی نجد کے قریب تھا اور اکثر لیلیٰ کا محمل اُدھر سے گزرتا رہتا تھا۔ ناقۂ لیلیٰ کی گھنٹیاں مجنوں کے کانوں میں اس درجہ بس گئی تھیں کہ وہ دُور سے آواز سن کر ناقہ کے پیچھے بھاگتا چلا جاتا تھا۔ کبھی غبارِ ناقۂ لیلیٰ کا تعاقب کرتا اور کبھی ناقہ کے پاؤں کی مٹی اٹھا کر آنکھوں سے لگاتا، چومتا اور دل سے لگائے ہوئے کئی کئی دن گزار دیتا۔

غالبؔ ؎
عالمِ بے سروسامانیٔ فرصت مت پوچھ
لنگرِ وحشتِ مجنوں ہے بیاباں میرا

لیلیٰ بھی مجنوں کے عشق میں مبتلا تھی لیکن اس کا باپ خاندانی وقار سے مجبور تھا۔ رسوائی اور بدنامی سے ڈرتا تھا۔ اگر دونوں کی شادی کا مسئلہ کبھی اٹھا بھی تو وہ اتفاقات اور ناگہانی حادثات کی نذر ہوگیا۔ مجبور ہوکر لیلیٰ کے باپ نے دوسری جگہ لیلیٰ کی شادی کردی۔ لیکن یہ شادی لیلیٰ کو پسند نہ تھی۔ وہ اس صدمہ کو برداشت نہ کرسکی اور فراقِ مجنوں میں گھل گھل کر ختم ہوگئی۔ لیلیٰ کی موت کی روح فرسا خبر جب مجنوں تک پہنچی تو وہ دیوانہ وار لیلیٰ کی قبر پر گیا اور اس پر گر کر ختم ہوگیا۔ نہ تو لیلیٰ رہی اور نہ مجنوں۔ ان کے نام ہی کاغذ میں

بار قام رہ گئے ہیں۔

غالب سے
غمِ مجنوں، عزاداران لیلیٰ کا پرستشگر
خمِ رنگِ سیہ، پیمانۂ ہر چشمِ آہو تھا

اس قصہ کے لیے اردو میں صحرائے نجد، صحرائے مجنوں، محمل لیلیٰ، ناقہ لیلیٰ، غبار قیس، وادی نجد اور محمل نشیں کی تلمیحات استعمال ہوتی ہیں۔

آدمؑ و خُلد

(آدم سُریانی لفظ ہے۔ بائبل میں اس کو الف کے مد اور دال کے طول کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ یہ لفظ عربی کا ہے)

حضرت آدمؑ وہ پہلے انسان ہیں جنہوں نے اس کائنات ارضی پر پہلا قدم رکھا تھا۔ انسانوں کی نسل پھیلائی تھی اور خلافت حق کا مقدس مقصد پورا کیا تھا۔ نسلِ انسانی کے اس مورث اعلیٰ کو ابوالبشر، صفی اللہ اور باوا آدم بھی کہا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کو جب اس دنیا میں اپنا خلیفہ بھیجنے کی ضرورت ہوئی تو اس نے سب سے پہلے کھنکھناتی مٹی سے آدم کا پتلا تیار کیا اور پھر اس میں روح پھونکی تو وہ پتلا فوراً ہی گوشت و پوست کا انسان بن گیا۔ اس کے بعد فرشتوں کو حکم ہوا کہ اس انسان کے سامنے سربسجود ہو جاؤ۔ تمام فرشتوں نے حکم کی تعمیل کی لیکن عزازیل فرشتہ نے سجدہ نہ کیا۔ یہ علم و فضل میں تمام فرشتوں سے بڑھا ہوا تھا۔ فرشتوں کی تعلیم و تلقین اس کے سپرد تھی اور معلم الملکوت

کے لقب سے مشہور تھا۔ اس نے آدم کو سجدہ کرنے میں اپنی توہین محسوس کی اور صاف انکار کر دیا۔ عزازیل کے تمام مراتب اسی وقت چھین لیے گئے اور شیطان و ابلیس کے لقب دے کر طوق لعنت اس کے گلے میں ڈال دیا اور بارگاہِ الٰہی سے نکال دیا گیا۔[1] حضرت آدمؑ مدّت تک تنہا زندگی گزارتے رہے۔ جب ان کی فطرت کسی مونس و ہمدم کی جویا ہوئی، تو اللہ تعالیٰ نے حوّا[2] کو پیدا کیا[2] اور دونوں میاں بیوی کو جنّت میں قیام کی اجازت مل گئی۔ وہاں ایک درخت[3] معیّن کر کے بتا دیا گیا تھا کہ اس کو نہ چھوئیں اور نہ اس کے قریب جائیں۔ شیطان تو ان کو گمراہ کرنے کی فکر میں تھا اس نے شجر ممنوعہ کھانے کی ترغیب دی۔ حضرت آدمؑ کے بشری خواص میں پہلی بار بھول چوک نے ظہور کیا اور انہوں نے شجر ممنوعہ کا پھل کھا لیا۔ اللہ تعالیٰ کے حکم امتناعی کو بُھلا بیٹھے۔ اس پھل کا کھانا تھا کہ فوراً ہی بشری لوازم ابھرنے لگے اور دونوں میاں بیوی کو اپنی برہنگی کا احساس ہونے لگا۔ دونوں نے اپنے اپنے ستر پتّوں سے ڈھانپ لیے اور اس طرح تمدّنِ انسانی کی ابتدا ہوئی۔ دوسری طرف فوراً ہی حکم عدولی کی

۱؎ عزازیل یعنی ابلیس کو جب جنّت سے نکالا گیا تو اس نے توبہ و ندامت کی جگہ قیامت تک مہلت طلب کی تھی۔ جب اس کی درخواست قبول ہو گئی تو اس نے کہا تھا "جب تو نے مجھے راندۂ درگاہ کر ہی دیا ہے تو اب میں بنی آدم کو گمراہ کروں گا اور ان کو ناشکر گزار بناؤں گا۔" اسی دن سے شیطان کا کام بنی آدم کو بہکانے اور اس کو معصیت کی ترغیب دینے کا ہو گیا ہے۔

۲؎ قرآن مجید میں حوّا کی پیدائش کے لیے صرف اتنا مذکور ہے "وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا" یعنی "اس (نفس) سے اس کے جوڑے کو پیدا کیا۔ یہ روایت غالباً توریت و انجیل کی ہے کہ حوّا آدم کی بائیں پسلی سے پیدا ہوئی تھیں۔ بخاری اور مسلم کی ایک حدیث میں بھی پسلی کی تصدیق موجود ہے۔ ابن اسحٰق نے اس سے مراد بائیں پسلی لی ہے۔

۳؎ قرآن مجید میں شجرہ ممنوعہ (شجر خلد) کی وضاحت نہیں کی گئی ہے کہ یہ درخت کس چیز کا تھا۔ مفسرین نے اس کو گیہوں کا درخت قرار دیا ہے۔ انجیل میں 'کتاب پیدائش' کے تحت اس درخت کو "شجر تعقل" لکھا گیا ہے۔ اس سے مراد عقل و حکمت کا درخت ہے۔ اردو شاعری میں شجر ممنوعہ کا پھل گندم ہی عام طور پر لیا گیا ہے۔

باز پُرس ہوئی اور عتابِ الٰہی نازل ہوا۔ حضرت آدمؑ نے ندامت اور عجز کے ساتھ اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا اور عفو و درگزر کے طالب ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کے عذر کو قبول تو کر لیا لیکن بہ تقاضائے حکمت ایک معیّن مدّت کے لیے زمین پر قیام کا حکم دیا۔ اس طرح حضرت آدمؑ اپنی رفیقۂ حیات کے ساتھ دنیا میں تشریف لائے اور ابوالبشر بنے۔ نزولِ آدم کا مقام کوہِ سراندیپ بتایا جاتا ہے۔

شعرا نے اس واقعہ کو طرح طرح سے رنگ دے کر لکھا ہے۔ کوئی تو اُن کو خُلد[1] سے نکالتا ہے اور کوئی اس کو گناہ کے نام سے تعبیر کرتا ہے۔ حقیقت میں یہ نہ گناہ تھا اور نہ نافرمانی بلکہ ایک معمولی لغزش یا وسوسہ تھا۔ حضرت آدمؑ کی عصمت کا مسئلہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ طٰہٰ میں صاف کر دیا ہے۔ وہ فرماتا ہے "ہم نے اِس اقرار کے پورا نہ کرنے میں اس کے ارادے اور قصد کا دخل نہ پایا۔ اِسی طرح خلد سے دنیا میں آ کر نسل انسانی کی شروعات کرنا بھی مشیئتِ ایزدی تھی اور اسی مقصد کے لیے آدم کی تخلیق ہوئی تھی۔

غالب ؎

نکلنا خلد سے آدم کا، سنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

---

[1] خُلد بہشت کے ساتویں طبقہ کا اصطلاحی نام ہے لیکن عام طور پر بہشت مطلق کے معنوں میں بھی خلد کا استعمال ہوتا ہے۔ بڑے آدمیوں، نوابوں اور بزرگوں کے مرنے کے بعد مرحوم و مغفور کی جگہ "خلد آشیاں" بھی لکھا جاتا ہے۔ ایسے موقعوں پر "خلد آشیاں" سے مراد "جنّت مکانی" ہوتی ہے۔

ابنِ مریمؑ

ابن مریم حضرت عیسیٰؑ کی کُنیت ہے جو عام طور پر مسیح اور مسیحا کی مانند استعمال ہوتی ہے۔ حضرت آدمؑ کے بعد حضرت عیسیٰؑ کی ہی ذاتِ والا برکات ایسی ہے جو توالد و تناسل کے عام قانون کے خلاف محض حکم الٰہی اور ارادۂ باری تعالیٰ سے وجود پذیر ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ کو چونکہ اپنی قدرت کاملہ کا نشان ظاہر کرنا مقصود تھا، اس لیے ان کو بے پدر پیدا کیا۔ قرآن مجید میں اسی وجہ سے ان کو نسبتِ مادری سے مخاطب کیا گیا ہے۔

سورۂ آل عمران میں اللہ تعالیٰ نے مادرِ عیسیٰ یعنی حضرت مریمؑ کو بغیر کسی استثناء کے کائنات کی تمام عورتوں سے بڑھ کر برتر اور برگزیدہ ٹھہرایا ہے۔ سورۂ کھیعص میں اُن کا ذکر انبیاؤں کے زمرے میں کیا ہے۔ یہ دنیا کی پہلی عورت ہیں جن کو یہ شرف میسر ہوا ہے۔

غالب ؎

ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے دُکھ کی دَوا کرے کوئی

صاحبقرانی

صاحبقرانی کنایتہً طویل حکومت کرنے کو کہتے ہیں۔

قِران کے لغوی معنی برابر ہونے کے ہیں۔ علم نجوم کی اصلاح میں دو ستاروں کا ایک۔

برج میں جمع ہونا قِران کہلاتا ہے۔ جب دو سعد ستارے زہرہ و مشتری یا قمر و زہرہ یا قمر و مشتری ایک ساتھ جمع ہو جائیں تو اس کو قِران السعدین کہا جاتا ہے۔ اس ساعت کو انتہائی مبارک اور سعد خیال کیا جاتا ہے۔ کوئی شخص جب قران السعدین کی ساعت میں پیدا ہوتا ہے یا اس کا نطفہ اس گھڑی ٹھہرتا ہے تو وہ بہت خوش نصیب، عالی مرتبت اور بختاور سمجھا جاتا ہے۔ یہ قِران چونکہ مدت کے بعد ہوتا ہے۔ اس لیے ایسے وقت پر پیدا ہونے والے بادشاہوں کی حکومت بھی عرصہ دراز تک رہتی ہے اور ان کو صاحبقراں کہا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے امیر تیمور کو صاحبقران اوّل اور شاہجہاں کو صاحبقران ثانی کہتے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آنحضرت صلعم بھی صاحبقراں تھے۔

غالبؔ ؎

تم کرو صاحبقرانی جب تلک
ہے طلسمِ روز و شب کا در کھلا

تریاکیٔ قدیم

تریاک زہرمہرہ یعنی زہر کو مارنے والی دوا کو کہتے ہیں۔ کنایتہً افیون اور چنڈو کو بھی کہا جاتا ہے۔ اس لیے تریاکیٔ قدیم سے مراد پرانا چنڈو باز یا افیونی ہے۔ چنڈو بازوں کی محفلوں میں سامنے چراغ رکھ کر اس کی لو پر نال سے دھواں پیا جاتا ہے۔ شاعر لوگ بھی رات رات بھر چراغ کے قریب بیٹھ کر مشقِ سخن کرتے ہیں اور اس کا دھواں ان کے پیٹوں میں جاتا ہے اس لیے غالبؔ نے شاعروں کو بھی پرانے چنڈو بازوں کا مثیل قرار دیا ہے۔

غالب ؎ تازہ نہیں ہے نشۂ فکرِ سخن مجھے
تریاکیٔ قدیم ہوں، دودِ چراغ کا

حمزہ کا قصّہ

حمزہ کا قصہ طول طویل اور لمبی چوڑی داستان کو کہتے ہیں جو شیطان کی آنت کی مانند دراز ہو اور اس کی کوئی انتہا نہ ہو۔

حمزہ کا قصہ ایک فرضی داستان ہے جس میں حضرت امیر حمزہؓ کے کارناموں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ یہ قصہ رموز حمزہ کے نام سے پہلے ایران میں تصنیف ہوا تھا۔ ہندستان میں پہلی بار اکبر اعظم کے حکم سے علامہ فیضی نے اس کو دوبارہ تصنیف کیا۔ اس کا اردو ترجمہ ہی داستان امیر حمزہ کے نام سے مشہور ہے۔

رموز حمزہ کا ذکر آئینِ اکبری میں بھی موجود ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہندستان میں یہ قصہ سنہ ۱۰۲۰ھ اور سنہ ۱۰۸۳ھ کے درمیان کبھی آیا ہوگا لیکن اس کی آمد کی کوئی تاریخی سند موجود نہیں ہے۔ ہندستان میں رموز حمزہ کا اردو ترجمہ اصل داستان سے بھی بہت بڑھ گیا ہے۔ یہاں کے داستان گویوں نے رام پور اور اودھ کے نوابین کی سرپرستی میں اس کی وسعت خوب کی ہے۔ اردو میں اب اس داستان کے چودہ ۱۴ دفتر ہیں۔ ہر ہر دفتر کئی کئی ضخیم جلدوں اور ہزاروں صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ (تلمیح تھا کی ڈاڑھی بھی دیکھیے) غالب ؎

ہر بُنِ مُو سے دمِ ذکر، نہ ٹپکے خوں ناب حمزہ کا قصہ ہوا، عشق کا چرچا نہ ہوا

بناتُ النعشِ گردوں

عرب میں جنازہ اٹھانے والے کو ابن النعش کہا جاتا ہے اور اس کی جمع بنات النعش ہے۔ علم نجوم کی اصطلاح میں بنات النعش وہ سات ستارے ہیں جو قطب کے گرد اگرد پھرا کرتے ہیں۔ اُن میں سے چار ستاروں کو جنازے اور تین کو جنازہ بردار سمجھا جاتا ہے۔

ہندی میں ان ستاروں کو سبت رسین یعنی سات رشی کہا جاتا ہے۔ مشہور ہے کہ یہ ساتوں سادھو تھے جو اکلِ حلال کی تلاش میں نکلے تھے۔ اُن کے ساتھ ایک عورت بھی تھی۔ دھرم نے اُن ساتوں کو اُٹھا کر آسمان پر پہنچا دیا ہے، جہاں وہ ستاروں کی مانند چمکتے رہتے ہیں۔ بنات النعش کا دھندلا ستارہ اُن کے ساتھ کی عورت ہے۔ اُس کو سُہا کہا جاتا ہے۔

غالبؔ ؎

تھیں بناتُ النعشِ گردوں، دِن کو پردے میں نہاں
شب کو اُن کے جی میں کیا آئی کہ عُریاں ہوگئیں

فرشتہ

فرشتہ کی اصل فرستہ ہے۔ یہ فرستادن سے اسم مفعول ہے جس کے معنی ہیں بھیجا ہوا۔ اصطلاحی معنی میں خدا کے نورانی قاصد کو کہتے ہیں جس کا ایک نام ملک بھی ہے۔ کنایۃً معصوم متقی اور پرہیزگار کو کہا جاتا ہے۔ فرشتہ کی تخلیق نور سے ہوئی ہے۔ وہ نہ مرد ہے اور نہ عورت۔

وہ معصوم ہے یعنی اس سے گناہ سرزد ہی نہیں ہو سکتا۔ تمام فرشتے اپنے مخصوص اور متعین کام پر ہر وقت مستعد اور قائم ہیں۔ یہ کھانا، پینا، ہنسنا، بولنا اور دوسرے بشری لوازم سے بے بہرہ ہیں، خدا کی عبادت اور اُس کی تسبیح و تہلیل پر اُن کی زندگی موقوف ہے۔

غالب ؎ پکڑے جاتے ہیں، فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

مرزا غالب کے اس شعر میں فرشتوں سے مراد کاتبِ اعمال ہے۔ یہ فرشتے انسانی اعمال و افعال کو ضبطِ تحریر میں لاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان پر دو فرشتے مقرر کیے ہیں جو اُس کے دائیں اور بائیں کاندھوں پر تعینات رہتے ہیں۔ داہنی طرف والا فرشتہ نیکیاں اور بائیں طرف والا فرشتہ اعمالِ بد کو لکھتا ہے۔ اِن فرشتوں کو کراماً کاتبین اور اخبار کے فرشتے بھی کہا جاتا ہے۔ ان کے ذریعہ جو ریکارڈ تیار ہوتا ہے اُس کو صحیفۂ اعمال، نامۂ اعمال اور اعمال نامہ کہا جاتا ہے۔

آج کل موجودہ سائنس نے بھی اس اصول کو تسلیم کر لیا ہے کہ ہر وہ آواز جو لاکھوں سال قبل پیدا ہوئی تھی آج بھی زیرِ آسمان موجود ہے اور کوئی بھی حرکت فنا نہیں ہوتی ہے۔ قرآن مجید نے اسی کلیہ کو اپنی متعدد آیتوں میں بیان کیا ہے۔ انسان کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ، دماغ میں آیا ہوا ہر خیال اور جسم کی ہر حرکت چاہے وہ کتنی ہی تنہائی میں کی گئی ہو، فوراً ہی نوٹ کر لی جاتی ہے۔ خدائی شاہد اُس کو سننے، دیکھنے اور ضبطِ تحریر میں لانے کے لیے ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ قیامت کے دن جب تمام مخلوق اپنے پروردگار کے سامنے کھڑی ہوگی اور رائی رائی کا حساب لیا جا رہا ہوگا۔ میزانِ حساب کھڑی ہوگی۔ اُس وقت حساب کے فرشتے ہر شخص کا نامۂ اعمال اللہ تعالیٰ کے حضور میں پیش کریں گے۔ اُس وقت انکار، تردید، بہانہ اور حیلۂ شرعی کی کوئی گنجائش نہ ہوگی۔

طِلائے دستِ افشار اور تُرنجِ زر

طلائے دست افشار ایسے سونے کو کہتے ہیں جو موم کی مانند نرم ہو اور ہاتھ سے دبانے پر دب کر حسب خواہش شکل اختیار کرلے۔ مشہور ہے کہ ایران کے مشہور بادشاہ خسرو پرویز[1] کے

---

1. خسرو پرویز ایران کا مشہور بادشاہ تھا۔ یہ خسرو اول یعنی نوشیرواں عادل کا پوتا اور ہرمز چہارم کا بیٹا تھا۔ ۵۹۰ء میں اپنے باپ کو قتل کرکے تخت نشین ہوا اور ۶۲۸ء میں اپنے بیٹے شیرویہ کے ہاتھوں قتل ہوا۔ پہلے تو خسرو دوم کہلایا پھر ابہرویز (فارسی پرویز) بمعنی مظفر کے لقب سے مشہور ہوا۔ اس نے اپنے اڑتیس سالہ دورِ حکومت میں متعدد ممالک فتح کیے اور بے شمار دولت جمع کی۔ مورخین نے اُس کے بارہ عجائبات کا ذکر کیا ہے جن میں سے چند کے نام دیے جاتے ہیں:-

(۱) تختِ طاقدیس۔ خسرو کا عجیب وغریب تخت جو ہاتھی دانت اور ساگون کا بنا ہوا تھا۔ اُس کے کٹہرے سونے اور چاندی کے تھے۔ اس تخت کا طول ۱۸۰ ہاتھ، عرض ۱۳۰ ہاتھ اور بلندی ۱۵ ہاتھ تھی۔ تخت پر لاجوردی کام کا سونے کا گنبد تھا جس میں اندر کی جانب ساتوں آسمان، ستارے، برج اور ساتوں اقلیم کی تصویریں بنی تھیں۔ اس کے علاوہ بادشاہوں کی تصویریں، رزم بزم کے نظارے اور شکار کے مناظر کندہ تھے۔ یہ تخت فریدوں کے زمانہ سے چلا آرہا تھا لیکن خسرو نے اس میں جدتیں کی تھیں۔

(۲) باربُدگویا۔ یہ خسرو کے دربار کا مشہور گویا تھا جو ایرانی موسیقی کا موجد سمجھا جاتا ہے۔ اُس کی کتابِ موسیقی گنج عروس اور سات خسروانیات (شاہی طرزیں) دنیائے موسیقی میں مشہور ہیں اس کا رتبہ دربارِ خسرو میں کافی بلند تھا۔

(۳) قصر طیفون۔ اس کا بنوایا ہوا مشہور محل جس میں خزانہ رکھا جاتا تھا۔

(۴) درفش کاویانی۔ کاوہ آہنگر کا مشہور جھنڈا جو ضحاک کے ظلم وستم کے خلاف اٹھایا گیا تھا یہ مرصع بہ جواہر تھا اور ایرانی فوج کے لیے فال نیک سمجھا جاتا تھا۔ ایران کے تمام بادشاہوں نے اپنے اپنے دورِ حکومت میں اس پر اتنے جواہرات لگائے تھے کہ عجوبہ روزگار (باقی آئندہ صفحہ پر)

پاس بارہ عجائبات تھے، اُن میں طلائے دست افشار بھی تھا۔ یہ ایک مخصوص قسم کا کندن تھا جو موم کی مانند نرم تھا۔

غالبؔ ؎ آم کو دیکھتا اگر یک بار
پھینک دیتا طلائے دست افشار

خسرو پرویز اِس سونے سے طرح طرح کی چیزیں اپنے ہاتھ سے بنا لیا کرتا تھا۔ اکثر اِس کا ترنج بنا کر اپنے دستر خوان پر بھی زینت کے واسطے رکھ لیا کرتا تھا۔ اسی ترنج (لیموں) کو تُرنج زر کہا جاتا ہے۔

(گذشتہ سے پیوستہ) ہو گیا تھا۔ اس پر فتح وظفر کے لیے خاص ہندسوں اور علامتوں کی کوئی طلسمی شکل بھی کڑھی ہوئی تھی۔ اس کی قیمت کا اندازہ بیس لاکھ دینار لگایا جاتا ہے۔

(۵) فرش نو بہار۔ ساٹھ گز طول وعرض کا یہ فرش سونے کے تاروں سے بنا ہوا تھا جس پر جابجا جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ جواہرات کی کثرت اور تابانی سے یہ ہر آن نئے رنگ بدلتا تھا اور موسم بہار کا لطف دیتا تھا۔

(۶) ملکہ شیریں۔ خسرو کی بیوی شیریں تھی۔ اُس پر فرہاد سنگتراش عاشق ہو گیا تھا۔ اِن دونوں کی داستانِ محبت اور جوئے شیر کی کہانیاں خسرو کے زمانہ میں ہی ایران کے قومی افسانے کا جز بن چکی تھیں۔

(۷) شبدیز گھوڑا۔ خسرو کا سیاہ رنگ کا گھوڑا جو عام گھوڑوں سے چار بالشت بلند تھا۔ یہ خسرو کو بہت عزیز تھا۔ اُس نے قسم کھائی تھی کہ شبدیز کی موت کی خبر سنانے والا قتل کر دیا جائے گا۔

(۸) ہفت گنج خسرو۔ خسرو کے سات خزانے مشہور ہیں۔ اِن میں اسّی کرور مثقال تو صرف سونا ہی تھا۔ اِن خزانوں کے نام تھے: گنج عروس، گنج بادآورد، گنج دیبا، گنج افراسیاب، گنج سوختہ اور گنج خضرا۔

(۹) فیل سفید۔ خسرو کے پاس ایک سفید ہاتھی بھی تھا جو عجوبۂ روزگار سمجھا جاتا ہے۔

(۱۰) طلائے دست افشار۔ اِس کی تفصیل اوپر دی گئی ہے۔

غالب ؎ تھا ترنجِ زر، اک خسرو پاس
رنگ کا زرد، پر کہاں بو، باس

نوروز

نوروز ایران کا قومی اور موسم بہار کا تہوار ہے۔ اِس کی ابتدا سال کے پہلے دن یعنی ماہ فروردین کی پہلی تاریخ کو ہوتی ہے کیوں کہ اُس دن آفتاب برج حمل کے نقطۂ اوّل میں آتا ہے اور بہار کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ تہوار اب تیرہ دن تک منایا جاتا ہے۔ اِس میں بازار اور دوکانیں سجائی جاتی ہیں۔ چراغاں ہوتا ہے۔ ناچ رنگ کی محفلیں جمائی جاتی ہیں۔ لوگ ایک دوسرے پر رنگ اور گلال ڈالتے ہیں۔

زرتشتی عقیدہ کے مطابق اللہ تعالیٰ نے دنیا کی تخلیق اِسی دن کی تھی۔ سارے سیّارے اس دن اوج تدویر میں تھے اور سب کا اجتماع برج حمل کے نقطۂ اوّل میں تھا۔ خدا کے حکم پر وہ ایک دم گردش کرنے لگے اور اُسی دن دنیا میں حضرت آدمؑ کا نزول ہوا۔ ایک پہلوی کتاب جو نسبتاً متاخر زمانہ کی ہے، اُس میں نوروز کی تمام تفصیلات دی گئی ہیں۔ اِن میں اُن حالات کے علاوہ جو ماضی میں گزر چکے ہیں وہ بھی دیے ہیں جو مستقبل میں پیش آئیں گے۔ عربی اور فارسی کے اکثر شعراء نے جشن نوروز کا ذکر کیا ہے۔

فردوسی کے بیان کے مطابق ایک بار بادشاہ جم سیاحت کو نکلا تو آذربائیجان کے قریب وہ دن آگیا جو آفتاب کے برج حمل میں آنے کا دن تھا۔ جم ایک تخت اونچی جگہ پر

رکھوا کر مشرق کی طرف مُنھ کر کے بیٹھ گیا۔ جب آفتاب طلوع ہوا تو اُس کی پہلی شعاع تخت پر پڑی۔ جس سے تاج اور تخت میں لگے ہوئے سارے جواہرات جگمگا اٹھے۔ لوگ اِس کیفیت کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور انھوں نے اُس دن کا نام "نوروز" رکھ لیا۔ جمشید کا نام بھی اِسی واقعہ کی یادگار ہے۔ پہلوی زبان میں 'شید' کے معنی شعاع کے ہیں۔ بادشاہ کا نام پہلے صرف جم تھا اُس میں 'شید' کا اضافہ کر کے اُس یادگار کو محفوظ کیا گیا ہے۔

جمشید کے زمانہ سے اب تک یہ تہوار ایران میں ہر سال منایا جاتا ہے۔ نوروز کے علاوہ اِس کو "جشنِ جمشید" بھی کہا جاتا ہے۔ پہلے یہ تہوار چھ دن تک منایا جاتا تھا اِس میں شاہان ایران اور خاص طور پر ساسانی بادشاہ دربار کرتے تھے۔ امراء اور اراکین سلطنت اِس دربار میں بادشاہ کو تحفے نذر کرتے تھے اور بادشاہ اُس کے بدلے میں انعام واکرام کی بارش کرتا تھا۔ صوبوں کے نئے گورنر مقرر کیے جاتے تھے۔ نئے سِکّے مضروب ہوتے تھے اور آتشکدوں کی صفائی ہوتی تھی۔

غالبؔ ؎

نوروز ہے آج اور وہ دن ہے کہ، ہوئے ہیں
نظارگی صنعتِ حق، اہلِ بصارت

بُت خانۂ آزر

بُت خانۂ آزر کنایۃً ایسی جگہ کو کہتے ہیں جہاں حسینوں کا مجمع اور معشوقوں کا جمگھٹ ہو۔ آزر حضرت ابراہیمؑ کے مشرک باپ کا نام تھا۔ یہ ایک ماہر بُت تراش اور بُتوں کا بیوپاری

تھا۔ اپنے ملک کے سب سے بڑے بُت خانہ کا پجاری بھی تھا۔ اِس لیے اُس کا بُت خسانہ بھی مشہور ہے جہاں چھوٹے بڑے، اچھے بُرے اور بیش قیمت و کم قیمت ہر قسم کے بُت ہر وقت تیار رہتے تھے۔

توراۃ میں حضرت ابراہیمؑ کے باپ کا نام تارخ اور قرآن مجید میں آزر بتایا گیا ہے۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ تارخ اسمی اور آزر وصفی نام ہے۔ اصل میں کالدی زبان میں آدار بڑے پجاری کو کہا جاتا ہے۔ تارخ چونکہ سب سے بڑا پجاری تھا اس لیے عربی زبان میں آدار کا آزر بن گیا۔

آزر کو راہِ راست پر لانے کے لیے اُس کے بیٹے حضرت ابراہیمؑ نے ہر چند کوشش کی لیکن جب وہ کفر و ضلالت کی زندگی چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوا تو انھوں نے اس سے علحدگی اختیار کرلی۔

غالب ؎

نقشِ پا کی صورتیں، وہ دِل فریب
تو کہے بُت خانۂ آزر کھُلا

دوزخ اور بہشت

دوزخ جہنم کو کہتے ہیں جہاں گنہگاروں کو جلنے کا عذاب دیا جاتا ہے۔ بہشت کے معنی باغ کے ہیں۔ یہ نعمتوں اور مسرّتوں کا باغ ہے جو اللہ تعالیٰ نے نیکوکار انسانوں کے لیے بنایا ہے۔ دوزخ تحت الثریٰ کے سات طبقوں کا نام ہے جو عقابِ الٰہی کا گھر ہے اور اُس میں گنہگاروں کو عذابِ الحریق دیا جاتا ہے۔ انسانی گناہوں کے نتائجِ بد کا نام عذاب ہے۔

یہ عذاب آتشِ دوزخ اور اُس کے شدید آلام کی صورت میں لازم ہوگا۔ دوزخ کے ساتوں طبقوں کے نام بھی مختلف ہیں جو اُس کے عذاب کی شدّت کے مطابق رکھے گئے ہیں۔ نام یہ ہیں :-

ہاویہ، لظیٰ، سعیر، سقر، حطمہ، جحیم اور جہنم۔

بہشت اور جنّت کے معنی باغ کے ہیں۔ یہ انسانوں کا موروثی اور دائمی مقام ہے جو نیکوکار انسانوں کے لیے ہے۔ جنّت میں ہر قسم کی لذتیں اور مسرّتیں نیک انسانوں کو حاصل ہوں گی جن کا لطف دائرہ تصوّر میں بھی نہیں آسکتا۔ اُس میں کوئی بھی روحانی یا جسمانی آزار نہ ہوگا۔ خوف و غم نہ ہوگا۔ رشک و حسد نہ ہوگا اور کوئی بھی فکر و پریشانی نہ ہوگی۔ وہ ایک مقام راحت و سکون ہے جہاں ہر طرف نور ہی نور ہے ظلمت و تاریکی کا کہیں نام و نشان بھی نہیں ہے۔ وہاں انسانوں کا کام صرف اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تہلیل اور حمد و ثنا ہوگا۔ جنّت کی نعمتوں میں سب سے اعلیٰ و برتر نعمت قُربِ باری تعالیٰ ہے جو وہاں میسّر ہوگا۔ آخری اور سب سے بڑی نعمت تجلّی باری تعالیٰ ہے جس سے جنّت کے لوگ مشرف ہواں گے۔ اُس مقام کے لیے قرآن مجید میں عموماً جنّت کا نام ہی بتایا گیا ہے لیکن بعض مقامات پر اُس کو مناسب اضافتوں کے ساتھ میں ادا کیا گیا ہے جیسے جنّت الخلد (بقائے دوام کا باغ)، جنّت عدن (دائمی سکونت کا باغ)، جنّت الماویٰ (پناہ کا باغ)۔ اس کے علاوہ دوسرے لفظوں سے بھی اُس کی تعبیر کی گئی ہے جیسے فردوس (باغ)، روضہ (چمن)، دارالخلد (ہمیشگی کا گھر)، دارالمقام (قیام کا گھر) اور دارالسلام (امن و سلامتی کا گھر) وغیرہ۔

غالبؔ ؎

طاعت میں تا رہے نہ مےَ و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

طوبیٰ و سدرہ

یہ دو درختوں کے نام ہیں۔ طوبیٰ کا درخت جنت میں ہے اور سدرہ عرش کا درخت ہے۔ مشہور ہے کہ طوبیٰ کی شاخیں اس قدر پھیلی ہوئی ہیں کہ ہر ہر بہشتی کے گھر میں اُس کی ایک شاخ ہوگی۔ اُس شاخ سے طرح طرح کے میوے، پھل اور خوشبوئیں حاصل ہوں گی۔ بہشتیوں کا دل جس وقت بھی کسی پھل یا میوے کو چاہے گا اِس درخت کی شاخ خود بخود جھک کر سامنے آجائے گی اور اُس سے مطلوبہ چیز مل جائے گی۔

سدرہ یا سدرۃ المنتہیٰ انتہائی کی بیری کا درخت ہے جو جبریل فرشتہ کے رہنے کا مقام ہے۔ اُس سے آگے کسی بھی فرشتہ کی رسائی ممکن نہیں ہے۔ اِس درخت کی جڑ پانچویں یا چھٹے آسمان پر ہے اور اِس کی شاخیں ساتویں آسمان سے بھی آگے بڑھی ہوئی ہیں۔ یہ مقامِ نزول و عروج ہے یعنی چیزیں جہاں سے زمین پر اُترتی ہیں اور اوپر چڑھتی ہیں۔ اس مقام سے آگے آنحضرت صلعم کے علاوہ کسی بھی نبی یا فرشتہ کا گزر نہیں ہوا ہے۔ آنحضرت صلعم نے معراج کا واقعہ بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا "مجھے سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچایا گیا جو تمہاری بولی چال میں انتہا کی بیری کا درخت ہے۔ اِس کا پھل ہجر کی ٹھلیا کے برابر ہے اور اُس کے پتے ہاتھی کے کان کے برابر چوڑے ہیں۔ پر ملائکۃ اللہ جگنو کی مانند لاتعداد چمک رہے تھے۔ خدا کی خاص تجلّی نے اِس درخت کو حیرت انگیز طور پر روشن، چمکدار اور پُر کیف بنا دیا تھا۔"

محدثین کے نزدیک اِس درخت سے حقیقتاً ایمان و حکمت کو مشکّل اور مصوّر طریقہ سے ظاہر کیا گیا ہے۔ اِس سے ایمان، نیت صالح، قول صالح اور عمل صالح کو تمثیلاً بتایا گیا ہے۔ اس طرح درخت کا پھل اپنے ذائقہ، خوشبو اور سائے کے لحاظ سے ہر چہار

صفات کا حامل ہے۔ اِس کا پھل ذائقہ میں نیت صالح، خوشبو میں قول صالح اور سائے میں عمل صالح کو ظاہر کرتا ہے اور اِن سب کا مجموعہ ایمان ہے۔ آنحضرتؐ صلعم نے ایمان کو شجر سے تشبیہ دی ہے۔

اِسی درخت پر جبریلؑ کو احکامات باری تعالیٰ ملتے ہیں اور جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ کے حضور میں عرض کرنا ہوتا ہے یہاں سے ہی عرض کیا جاتا ہے۔ اِس سے آگے بڑھنے کی اجازت نہیں ہے۔

غالبؔ ؎
رہروِ راہِ خُلد کا توشہ
طوبیٰ و سدرہ کا جگر گوشہ

لقا کی ڈاڑھی اور عمر کی زنبیل

لقا کی ڈاڑھی ایسی چیز کو کہتے ہیں جو بہت زیادہ آراستہ پیراستہ، سجی سنوری اور مکلّف و مزیّن ہو۔ زنبیلِ عمر سے مراد ایسی چیز ہے جو کبھی پُر نہ ہو یا ایسا پیٹ جو ہمیشہ خالی رہے یا بسیار خور کا پیٹ۔ یہ دونوں تلمیحات داستان امیر حمزہ کی ہیں۔

لقا مشرک بادشاہ کا نام تھا جو داستان امیر حمزہ کا مرکزی کردار ہے۔ اِس نے خدائی کا دعویٰ بھی کیا تھا۔ حضرت امیر حمزہ نے، داستان کے مطابق، لقا کو راہ راست پر لانے کی ہر چند کوشش کی لیکن وہ دعویٰ ربوبیت سے دست بردار نہ ہوا۔ سینکڑوں بالاُس سے جنگ ہوئی۔ ہر مقابلہ میں وہ ذلیل و رسوا ہو کر توبہ کرتا اور پھر موقعہ پا کر فرار ہو جاتا تھا۔ یہ

سلسلہ مدتِ دراز تک چلتا رہا اور داستان کے دفتر بڑھتے گئے۔ داستان کے مطابق لقا کا قد ستّر ارنج کا تھا اور اُس کی ڈاڑھی بھی کئی گز لمبی اور چوڑی تھی۔ یہ پوری ڈاڑھی ہر وقت مرصع بہ جواہر رہتی تھی۔ اُس کے بال بال میں موتی پروئے ہوئے تھے۔ اب عام طور پر لمبی چوڑی ڈاڑھی کو بھی لقا کی ڈاڑھی کہا جاتا ہے جس کا بناؤ سنگار بہت ہوتا ہو۔

زنبیل کے معنی ٹوکری، جھولی اور کاسہ گدائی کے ہیں۔ امیر حمزہ کی مذکورہ جنگ میں اُن کے لشکر کے عیار کا نام عمر یا عمرو بتایا گیا ہے۔ اِس عیار کو بزرگوں سے بہت سے عجائبات حاصل ہوئے تھے، اُن میں یہ زنبیل بھی تھی۔ اِس زنبیل کی خوبی یہ تھی کہ دنیا کی ہر چیز اس میں سما جاتی تھی اور وہ کبھی پُر نہ ہوتی تھی۔ ایک دنیا اس کے اندر آباد تھی جس میں شیاطین، جن اور جادوگر شامل تھے۔ یہ سب عمرو کے قیدی سمجھے جاتے تھے۔ اِن سے زنبیل کے اندر ہی کھیتی باڑی کی مشقت لی جاتی تھی اور پہننے کے واسطے ایک غرقی دی جاتی تھی۔

داستان امیر حمزہ میں حضرت امیر حمزہؓ کا قصہ دیا گیا ہے جو جنگ اُحد کے شہید، عمِ رسول اور جلیل القدر صحابی تھے اسی طرح عمرو عیار کو عمرو بن امیتہ الضمیری ظاہر کیا گیا ہے یہ بھی مشہور صحابی رسولؐ اور تیز روی میں مشہور تھے۔ اِن ناموں کو اِس قسم کے خیالی افسانے سے منسوب کرنا داستان گویوں کے لیے مناسب نہ تھا۔ ہر قوم اور مذہب میں اِس قسم کی رزمیہ داستانوں کا اہم مقام ہوتا ہے لیکن ان کے کردار بھی سب فرضی ہوتے ہیں اس داستان میں یہ احتیاط ملحوظ نہیں رکھی گئی۔

غالبؔ ؎ دُرِ معنی سے مرا صفحہ لقا کی ڈاڑھی
غم گیتی سے مرا سینہ عمر کی زنبیل

عنقا

عنقا کا ماخذ عنق یعنی گردن ہے۔ اِس کا تلفظ بفتح صحیح اور بضم غلط ہے۔

عنقا ایک معلوم الاسم اور مجہول الجسم پرند کا نام ہے جو اپنی لمبی گردن کی وجہ سے اِس نام سے مشہور ہے۔ اِس پرند کو آج تک کسی نے دیکھا نہیں ہے اِس لیے عنقا، دیدۂ عنقا، پرِ عنقا اور بالِ عنقا وغیرہ ناپید و نایاب اور نادرالوجود چیزوں کے لیے آتا ہے۔ عنقا ہونے کے معنی بھی معدوم اور ناپید ہونے کے ہیں۔

غالب ؎

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا
میری آہِ آتشیں سے، بالِ عنقا جل گیا

ویبسٹر نے اپنے لغات میں لکھا ہے کہ اِس خیالی جانور کا جسم عقاب اور شیر کی صورت سے مرکب ہے۔ اِس کا چہرہ عقاب کا، جسم شیر کا، دو بازو، ایک چونچ اور چار ٹانگیں بتائی جاتی ہیں۔ صاحب فرہنگ آصفیہ نے مورخ فرغانی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ایک بار شمالی مصر میں ایک جانور پکڑ کر عزیزِ مصر کے روبرو لایا گیا تھا، اِس پرند کی ڈاڑھی اور غبغب آدمی سے مشابہہ تھا، اُس کے پَر طرح طرح کے رنگ کے اور اعضا مختلف جانوروں کے تھے لوگ اس کو عنقا کہتے تھے۔ مشہور ہے کہ یہ پرند ساری دنیا میں ایک ہی ہوتا ہے اور پانچ چھ سو سال تک زندہ رہتا ہے۔ جب یہ پرند بوڑھا ہو جاتا ہے تو خود کو آگ میں جلا کر بھسم ہو جاتا ہے اُس کی خاک سے انڈہ پیدا ہو کر دوسرا عنقا جنم لیتا ہے۔ فارسی میں اِسی پرند کو سیمرغ کہا جاتا ہے جس سے رستم و زال کے بہت سے قصے وابستہ ہیں لیکن شاہنامہ کے مطابق سیمرغ کے بچے بھی ہوتے ہیں اس لیے آگ میں جل کر بھسم ہونے والی بات سیمرغ پر صادق نہیں آتی ہے۔

غالبؔ ؎
خیالِ سادگی ہائے تصوّر نقشِ حیرت ہے
پرِ عنقا پہ راگِ رفتہ سے کھینچی ہیں تصویریں

غالبؔ ؎
مری ہستی فضائے حیرت آبادِ تمنّا ہے
جسے کہتے ہیں نالہ وہ اسی عالم کا عنقا ہے

رابطۂ قُربِ کلیم اور مائدہ بذلِ خلیل

یہ دونوں تلمیحات حضرت موسیٰؑ کے شرف ہمکلامی اور حضرت ابراہیمؑ کے شرف دوستی کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ کلیم حضرت موسیٰؑ کا لقب ہے اس کے معنی کلام کرنے والے کے ہیں اور خلیل حضرت ابراہیمؑ کا لقب ہے جو اُن کی مہمان نوازی، وسعت دستر خوان، اخلاق کریمانہ اور حلم کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا تھا اور اُن کو اپنا دوست قرار دیا تھا۔

حضرت موسیٰؑ نے وادی ایمن میں سب سے پہلے ندائے الہٰی سنی تھی اور لذت ہمکلامی سے مشرف فرمائے گئے تھے۔ اِس سے قبل یہ اعزاز کسی اور نبی کو نہ بخشا گیا تھا۔ اِس ہمکلامی اور گفتگو کے طول کا رابطہ بھی عجیب تھا۔ حضرت موسیٰؑ کو قرب الہٰی نے وارفتہ اور مسکت کر دیا تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے سلسلہ کلام کا آغاز اس طرح کیا کہ حضرت موسیٰؑ کو کچھ ہوش آ جائے۔ پہلا سوال یہ تھا کہ "اے موسیٰ یہ ترے ہاتھ میں کیا ہے؟" گویا یہ تمہید تھی حضرت موسیٰؑ کی زبان کھلوانے اور اُن کی وارفتگی کم کرانے کی۔ حضرت موسیٰؑ کو جواب دیتے وقت یہ خیال نہ رہا کہ جواب صرف اتنا ہی ہونا چاہیے جتنا سوال تھا۔ انہوں نے عرض کیا۔ "یہ میری

لاٹھی ہے۔" وفورِ جذبات سے بے قابو ہو کر وہ اس کی افادیت بھی بیان کرنے لگے۔" بکریاں چَراتے وقت میں اِس پر سہارا لیتا ہوں اور (اس سے) بکریوں کے پتّے جھاڑتا ہوں"۔ ابھی وہ اس کے اور بھی فوائد بیان کرتے لیکن یکایک اُن کو محبوبِ حقیقی کا پاس ادب مانع آیا اور پھر دل میں کچھ سوچ کر جلدی سے کہا " اور میرے لیے اس سے متعلق اور بھی ضروریات ہیں"۔ یہ اور بھی طول بیانی تھی لیکن اللہ تعالیٰ کو پسند آرہی تھی۔ ایک لاٹھی قربِ الٰہی کا رابطہ بنی ہوئی تھی۔

حضرت ابراہیمؑ کا لقب خلیل اور خلیل اللہ ایسے ہی پسندیدہ اوصاف کا انعام تھا۔ اُن کی مہمان نوازی نے تو ضرب المثل کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اُن کا معمول تھا کہ بغیر مہمان کے کبھی کھانا نہیں نوش فرماتے تھے۔ اتفاق سے اگر کوئی مہمان نہ ہو تو اُس دن فاقے سے رہتے تھے۔ ایک بار کا ذکر ہے کہ آپ کسی مہمان کی تلاش میں جنگل میں کھڑے تھے کہ ایک بوڑھا مل گیا۔ آپ اُس کو گھر لے آئے اور کھانا کھلا کر خدائے یکتا کا شکر ادا کرنے کو کہا۔ وہ بوڑھا بُت پرست تھا اُس نے خشمناک ہو کر جواب دیا " میں تیرے رب کو نہیں جانتا کہ کون ہے۔ میں تو اپنے معبود کا شکر گزار ہوں جو میرے گھر کے طاق میں رکھا ہوا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کو یہ الفاظ اِس درجہ ناگوار گزرے کہ انہوں نے بوڑھے کو اپنے گھر سے نکال دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اُن کو اپنے اِس عمل پر تکدر ہوا۔ انہوں نے سوچا کہ جس خدائے واحد کا میں شکر ادا کرانا چاہتا تھا وہ تو اتنا کریم ہے کہ اُس بوڑھے کو برابر اپنی نعمتوں سے نواز رہا ہے۔ اُس کی بُت پرستی اور کفر و شرک سے ناراض ہو کر ایک وقت بھی اُس پر رزق نہیں بند کر رہا ہے پھر مجھے کیا حق تھا اگر اُس نے میرا کہنا نہ مانا تو اُس کو گھر سے نکال دیا۔ غرضکہ یہ اوصاف جمیلہ تھے جو اللہ تعالیٰ کو محبوب تھے اور اللہ تعالیٰ نے اُن کو اپنا دوست قرار دیا تھا۔

غالب ؎ تجھ سے عالم پہ کھُلا رابطۂ قربِ کلیم
تجھ سے دنیا میں بچھا مائدہ بذلِ خلیل

یہاں مائدہ بمعنی کھانے کے استعمال ہوا ہے۔ مائدہ ایسے دسترخوان کو کہتے ہیں جس پر کھانا چُنا ہو۔ بذل کے معنی عطا و بخشش کے ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ کے دسترخوان کی وسعت اور فراخ حوصلگی کی نسبت سے "خوانِ خلیل" کی تلمیح بھی اُردو میں مستعمل ہے۔

سفیدیِ دیدۂ یعقوبؑ

حضرت یعقوبؑ اور اُن کے بیٹے حضرت یوسفؑ، دونوں بنی اسرائیل کے برگزیدہ اور جلیل القدر پیغمبر تھے۔ آپ دونوں پیغمبروں کے اُس سلسلہ سے تعلق رکھتے تھے جو حضرت ابراہیمؑ سے شروع ہوا تھا۔ اِس خاندان کی عظمت اور بزرگی میں سب سے اہم جملہ وہ ہے جو آنحضرت صلعم نے اِس کے متعلق فرمایا تھا " الکریم بن الکریم بن الکریم بن الکریمؒ " اِس اہم جملہ کی وجہ یہ ہے کہ نبوت اور ولایت کا یہ عظیم المرتبت سلسلہ مسلسل چار پشتوں تک چلا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ کو مجددِ ابنیاء اور دین حنیف کا موسسِ اوّل کہا جاتا ہے۔ اُن کے بعد ملتِ حنیفہ اور دین حق کی تکمیل اُن ہی کی نسل کے مبارک اور مقدس ہاتھوں ہوئی۔ آنحضرت صلعم بھی اُن کی ہی نسل سے تعلق رکھتے تھے آخر کار آنحضرت صلعم نے دنیا کو " اکملت لکم دینکم " کا پیغام سنایا۔ مرزا غالب کا ایک شعر ہے ؎

نہ چھوڑی حضرتِ یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی
سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

حضرت یعقوبؑ کی آنکھوں کا نور فراق یوسف میں رونے سے جاتا رہا تھا یا وہ زندان مصر کی دیواروں پر آگیا تھا۔ اِس سفیدی میں صنعت ابہام ہے یعنی ایک تو آنکھ کی پُتلی کی سفیدی اور دوسری سفیدی وہ جو دیواروں پر آرائش کے لیے پھیری جاتی ہے اور اُس کو عام طور پر قلعی کہا جاتا ہے۔ حقیقت میں سفیدی سے خانہ آرائی کا اشارہ اُسی موروثی تبلیغ اور دعوتِ حق کی طرف ہے یعنی حضرت یوسفؑ نے زندان میں بھی اِس کام سے غفلت نہ کی اور وہاں بھی اِس فرض کو بہ خوبی انجام دیتے رہے۔ زندان کے اہلکاران اور دوسرے زندانی سب ہی اُن کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے تھے۔ داروغۂ زندان نے اُن کے منصب اور اخلاقِ کریمانہ سے متاثر ہو کر انہیں زنداں کے اندرونی معاملات کا مہتمم بنا دیا تھا۔ اس طرح سالہا سال تک وہ زنداں میں رہے اور اپنے دادا ابراہیم کی ملّت کی تبلیغ کر کے لوگوں کے دلوں کی تاریکی کو ایمان کے نور سے منوّر کرتے رہے۔ فرعون مصر جب اُن پر مہربان ہوا تو اُس نے رہائی کا حکم دے دیا لیکن حضرت یوسفؑ کو غیر مشروط رہائی پسند نہ تھی۔ تمام معاملات کی تحقیقات از سر نو ہوئی۔ مجرموں نے اعتراف جرم کر کے یہ ثابت کر دیا کہ حضرت یوسفؑ کا دامن تمام آلودگیوں سے پاک تھا۔ اُس وقت وہ رہا ہوئے مملکت مصر کے امین و کفیل (عزیز مصر) بنا دیے گئے۔

غالب ؎

قید میں، یعقوب نے لی، گو، نہ یوسفؑ کی خبر
لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں

کاغذی پیرہن

قدیم زمانہ میں ایران کا یہ دستور تھا کہ " داد خواہ کاغذ کے کپڑے پہن کر حاکم کے سامنے جاتا تھا اور اُس کے لباس کو دیکھ کر ہی حاکم سمجھ لیتا تھا کہ یہ فریادی ہے۔ کنایتہً عجز و بے چارگی کے لیے بھی مستعمل ہے۔

غالب ؎
نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

اِس شعر کی تشریح کرتے ہوئے خود مرزا غالب نے لکھا ہے " ایران میں رسم ہے کہ داد خواہ کاغذ کے کپڑے پہن کر حاکم کے سامنے جاتا ہے، جیسے مشعل دن کو جلانا یا خون آلود کپڑا بانس پر لٹکا کرلے جانا۔ بس شاعر خیال کرتا ہے کہ نقش کس کی شوخی تحریر کا فریادی ہے کہ جو صورت تصویر ہے، اُس کا پیرہن کاغذی ہے یعنی ہستی اگرچہ مثل تصاویر اعتبار محض ہو، موجبِ رنج و ملال و آزار ہے۔" (عود ۔ ۱۶۰)

اکثر ایرانی شعراء نے اِس تلمیح کو استعمال کیا ہے۔ خاقانی نے لکھا ہے ؎

تا کہ دستِ قَدَر، از دستِ تو بر بود قلم
کاغذی پیرہن از دستِ قدر بادیدر

متاخرین میں بابا فغانی شیرازی نے لکھا ہے ؎

ز خوباں داد می خواہم، فغانی مہربانی کو؟
کہ سازد کاغذیں پیراہن از طومارِ افسوں ہم

(نسخہ عرشی ۔ نوائے سروش ۔ ۱۶۰)

حجرالاسود

حجرالاسود سیاہ رنگ کے اُس پتھر کو کہتے ہیں جو خانہ کعبہ میں رکن شامی پر لگا ہوا ہے اور دورانِ طواف اِس کو بوسہ دیا جاتا ہے۔ روایت ہے کہ حضرت آدمؑ نے جب کعبہ کی بنیاد رکھی تو طواف کی جگہ متعین کرنے کے لیے حجر اسود کو لگایا تھا۔ طوفان نوح میں اس پتھر کو اٹھا کر آسمان پر لے گئے تھے یا جبل بو قبیس میں امانت رکھ دیا تھا۔ مجددِ انبیاء حضرت ابراہیمؑ نے جب کعبہ کی از سرِ نو تعمیر کی تو اِس کو مقررہ جگہ پر دوبارہ لگا دیا گیا تھا جو اب بھی موجود ہے۔

غالب ؎ حجرالاسود دیوار حرم کیجے فرض
نافہ آہوے بیاباں ختن کا کہیے

تُنکْ ظرفیِ مَنصُور

مرزا غالب کا شعر ہے ؎

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں دریا ، لیکن
ہم کو تقلید تُنک ظرفیٔ منصور نہیں

اِس شعر میں تصوف کے مسئلہ وحدت الوجود کی طرف اشارہ ہے۔ اِس میں تمام موجودات کو حق تعالیٰ کا وجود ہی مانا جاتا ہے۔ اِس کی بنیاد پر منصور نے نعرہَ انا الحق

(میں خدا ہوں) بلند کیا تھا۔

منصور کا نام ابوالمغیث الحسین تھا لیکن اپنے باپ منصور البیضاوی الحلاج کے نام سے مشہور ہوا ہے۔ اِس کی پیدائش ۲۴۴ھ میں ہوئی تھی۔ اُس کی رگ وپے میں جو جلوہ گر تھا اُس کا اخفا نہ کر سکا اور نعرۂ انا الحق بلند کر دیا۔ علما نے اِس نعرہ پر کفر کا فتویٰ لگا کر تین سو ساٹھ کوڑوں کی سزا تجویز کی۔ اِس سزا کے بعد بھی جب منصور اپنے کلمہ سے باز نہ آیا، تو موت کی سزا تجویز ہوئی کیوں کہ شریعت کا فیصلہ ہمیشہ ظاہری اعمال واقوال پر ہوتا ہے۔ خلیفہ المقتدر باللہ کے حکم پر منصور کو دار پر سنگسار کیا گیا۔ پھر سر کاٹ کر لاش کو جلا یا گیا اور اُس کی خاک کو دجلہ میں بہا دیا گیا۔ مشہور ہے کہ ہر ہر سزا کے بعد منصور کی رگ وپے سے انا الحق کی صدا بلند ہوتی تھی۔ منصور کی ہلاکت اور سزا کی بنیاد صرف اتنی تھی کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتا تھا اُس کے لیے مناسب الفاظ اس کو نہ مل سکے اور جن الفاظ میں اُس نے اظہار کیا وہ تعزیرات شریعت کی حدود میں آتے تھے۔

حضرت مولانا شبلیؒ فرماتے ہیں کہ "ہم اور منصور ایک چیز ہیں۔ ہم دیوانہ بن کر چھوٹ گئے اور منصور کو دعویِٔ عقل نے برباد کیا۔" حضرت امام غزالیؒ اور حضرت مجدد سرہندیؒ نے بھی منصور کے دعوے کی تائید کی ہے۔ حضرت فریدالدین عطارؒ کا قول ہے۔ "جو لوگ تصوف کا دعویٰ کرتے ہیں اور منصور پر الزام لگاتے ہیں وہ یقیناً رمزِ توحید سے واقف نہیں۔"

خاتمِ جمشید

جمشید ایران کے مشہور پیشدادی سلسلہ کا چوتھا بادشاہ تھا، لیکن اہلِ ایران عام طور پر

حضرت سلیمانؑ کو ہی جمشید سمجھتے ہیں اور تمام ہی منشی کتبات کو اُن کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اِس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اِن دونوں بادشاہوں سے جو عظیم الشان اور دیو ہیکل عمارتیں منسوب ہیں، اُن کی تعمیر انسانوں کی نہیں معلوم ہوتی۔ یہ مشہور بھی ہے کہ ان عمارتوں کو جنّات اور دیووٗں نے تعمیر کیا تھا۔ قدیم تاریخ میں صرف حضرت سلیمانؑ ہی ایسے بادشاہ گزرے ہیں کہ انسانوں کے علاوہ دیو، پری، جن، چرند، پرند اور تمام دوسری مخلوق اُن کے تابع تھی اس لیے جمشید کو سلیمان سمجھا جاتا ہے۔ خاص طور پر جب بھی جم یا جمشید کے ساتھ خاتم، نگیں یا انگشتر کے الفاظ آئیں تو اُن سے مراد حضرت سلیمانؑ کی انگوٹھی سے ہوتی ہے (اِس انگوٹھی کے خصائص کے لیے 'سلیمان کا نگیں' کی تلمیح دیکھیے)

غالبؔ ؎

سلطنت دست بہ دست آئی ہے
جامِ مے، خاتمِ جمشید نہیں

بوترابؓ

بوتراب کے لغوی معنی 'مٹی کا باپ' ہیں۔ یہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی پسندیدہ کنیت تھی۔ اگر اِس کنیت سے کوئی مخاطب کرتا تو آپ کو مسرت ہوتی تھی۔ اِس کنیت کے متعلق روایت ہے کہ جب آنحضرت صلعم نے مکّہ سے مدینہ کو ہجرت فرمائی تو مہاجرین و انصار کو ایک دوسرے کا بھائی بنا دیا تھا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو کسی کا بھائی نہ بنایا اِس پر آپ اُداس ہو کر مسجد نبوی کے کچّے فرش پر جا کر لیٹ گئے اور پھر سو گئے۔ ہَوا کے چلنے سے جسم مبارک

غبار آلود ہو گیا تھا۔ آنحضرت صلعم نے جب اُن کے جسم پر گرد کو ملاحظہ فرمایا تو ازراہِ شفقت اِس طرح بیدار فرمایا "قم یا ابا تراب"۔ یعنی "اُٹھ اے مٹی کے باپ"۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ اُسی وقت بیدار ہو گئے۔ آنحضرت صلعم نے ارشاد فرمایا "میں نے مہاجرین اور انصار میں رشتۂ اخوت قائم کیا لیکن تم کو اِس لیے کسی کا بھائی نہ بنایا کہ تم میرے بھائی ہو۔ تم میرے لیے ایسے ہو جیسے موسیٰ کے لیے ہارون۔ حالانکہ میرے بعد کوئی نبی نہ ہو گا۔" اُسی دن سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی یہ کنیت مشہور ہوئی ہے۔

غالب ؎
غالب ندیمِ دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مشغولِ حق ہوں، بندگیِ بوتراب میں

طِلسمِ قُفلِ اَبجد

عربی حروفِ تہجی کو 'ابجد' کہا جاتا ہے۔ قفلِ ابجد ایسے قفل کو کہتے ہیں جس کے کُھلنے اور بند ہونے کا دارومدار حروفِ تہجی یا ہندسوں کی مقررہ ترتیب پر ہو۔ اِس قفل کے پرزے اِس طرح بنائے جاتے ہیں کہ جب تک اس کے حروف یا ہندسوں کی ترتیب نہ ملے قفل نہیں کھل سکتا۔ ایسے قفل عام طور پر بازار میں ملتے ہیں۔

غالب ؎
ہے کشادِ خاطرِ وابستہ، در رہنِ سخن
تھا طلسمِ قفلِ ابجد، خانۂ مکتب مجھے

کہتے ہیں کہ ابجد کے حروف کی ترتیب حضرت آدمؑ نے دی تھی اُن کے بعد حضرت

ادریسؑ نے کی۔ اب حضرت ادریسؑ کی ترتیب دی ہوئی ابجد جاری ہے۔ اِس میں آٹھ بامعنی کلمے ہیں جن میں سارے حروف ہجا آجاتے ہیں۔ ابجد ادریسؑ کے آٹھ کلمے یہ ہیں:۔ "ابجد، ھوز، حطی، کلمن، سعفص، قرشت، ثخذ اور ضظغ" ایک روایت یہ بھی ہے کہ یہ حروف ہجا نبطیوں سے حاصل ہوئے تھے کیوں کہ اُن کی ترتیب بھی وہی ہے جو عبرانی اور آرامی زبانوں میں پائی جاتی ہے۔ اہل عرب کا دعویٰ ہے کہ ان کلموں کو مدین کے چھ بادشاہوں نے اپنے نام سے ترتیب دیا تھا۔ بعض کا خیال ہے کہ شروع کے چھ کلمے قرشت تک شیاطین کے نام ہیں۔ کچھ لوگ اُن کو ہفتہ کے دنوں کے نام بھی قرار دیتے ہیں۔

سِکندر اور خضر

سکندر ایک مشہور فاتح کا نام ہے جس نے دنیا کے متعدد ممالک فتح کیے اور فاتح اعظم کے لقب سے مشہور ہوا۔ اُس کے وزیر کا نام خضر تھا۔ کنایتہً سکندر خوش بخت اور عالی مرتبت شخص کو کہا جاتا ہے۔

مشہور ہے کہ سکندر بادشاہ نے اپنے وزیر خضر کے ساتھ آب حیات کی تلاش میں سفر ظلمات اختیار کیا تھا۔ یہ مقام اتنا تاریک تھا کہ وہاں کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا اور گھور اندھیرا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے وہاں چاند سورج کبھی نکلا ہی نہ ہو۔ اس تاریکی میں سکندر نو راستہ

بھٹک گیا اور خضر نے منزلِ مقصود پر پہنچ کر آبِ حیات[1] کو پی لیا اور حیاتِ جاوداں پائی۔

غالبؔ ؎
بہ حسرت گاہِ نازِ کشتۂ جاں بخششِ خوباں
خضر کو چشمہ آبِ بقا سے ترجبیں پایا

ایک روایت یہ بھی ہے کہ سکندرؔ بھی چشمہ آبِ حیات تک پہنچا تھا۔ اُس نے چشمہ کے کنارے ہزاروں چرند و پرند ایسے دیکھے کہ آبِ حیات پی کر اپنی حیاتِ دوام سے عاجز پڑے سِسک رہے تھے۔ اُن کے جسموں میں جان ضرور تھی لیکن توانائی اور حرارت سے محروم تھے سکندرؔ نے عجز و بے چارگی کی زندگی پر موت کو ترجیح دی اور پینے کے ارادہ سے جو پانی چلّو میں بھرا تھا اُسے چشمہ میں ہی پھینک دیا اور آبِ حیات نہ پیا۔ خضر نے اُس پانی کو پی کر عمرِ دوام پائی۔ سکندر کی محرومی کا ذکر اکثر شعراء نے کیا ہے۔ غالبؔ ؎

کیا کیا؟ خضر نے سکندر سے — اب کسے رہنما کرے کوئی

---

[1] آبِ حیات اُس پانی کو کہتے ہیں جس کو پینے سے حیاتِ جاوداں حاصل ہو جاتی ہے اور موت کبھی نہیں آتی۔ کنایتہً لطیف، شیریں، مفرح اور جاں بخش چیز کو بھی کہتے ہیں۔ آبِ حیات کا تصوّر ہندو دیو مالا میں بھی موجود ہے اور اُس کو اَمرت کہتے ہیں۔ مشہور ہے کہ سمدر منتھن کے وقت جو چودہ رتن برآمد ہوئے تھے اُن میں اَمرت بھی تھا۔ دیوتاؤں نے اُس کو پی کر حیاتِ دوام پائی تھی۔ آبِ حیات کو آبِ حیواں، آبِ بقا، آبِ زندگانی اور خضر کی نسبت سے آبِ خضر بھی کہا جاتا ہے۔

غالبؔ ؎
مجھ کو وہ دو کہ جسے کھا کے نہ پانی مانگوں
زہر کچھ اور سہی، آبِ بقا اور سہی

غالبؔ ؎
ممکن ہے کرے، خضر سکندر سے ترا ذکر
گر لب کو نہ دے، چشمہ حیواں سے طہارت

غالبؔ
لبِ نگار میں آئینہ دیکھ آبِ حیات
بہ گمرہیِ سکندر ہے محوِ حیرانی

سکندر کے واقعات کو فردوسی اور مولانا نظامی گنجوی نے نظم کیا ہے اور اُس کو ایک پُراسرار شخصیت ذوالقرنین ظاہر کیا ہے۔ سکندر کے ساتھ ارسطو، سدِ سکندری، دیوارِ قہقہہ، یاجوج ماجوج، خضر ظلمات، آبِ حیات اور ذوالقرنین کے نام اکثر آتے ہیں اور اُن کے بیشمار قصے سکندر سے منسوب کیے جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سکندر نام کے دو جلیل القدر اور مشہور بادشاہ گزرے ہیں جو فاتحِ اعظم کہلاتے ہیں۔ اِن دونوں کے اوصاف کو ایک دوسرے سے اِس طرح ملا دیا گیا ہے کہ اُس سے طرح طرح کے شکوک پیدا ہوتے ہیں۔

اِن میں سے ایک مشہور فاتحِ اعظم سکندر یونانی تھا جسے سکندر رومی اور سکندر مقدونی بھی کہا جاتا ہے۔ یہ یونان کے بادشاہ فلپس کا بیٹا تھا اور حضرت عیسیٰؑ سے تین سو سال قبل پیدا ہوا تھا۔ یہ سکندر روم اور اسکندریہ کا بانی تھا۔ اِس کا وزیر، مشیر اور استاد یونان کا مشہور حکیم ارسطو تھا۔ اِس سکندر نے دارا ابن دارا کو قتل کر کے فارس کے ممالک پر قبضہ کیا تھا۔ اُس نے ہندستان اور چین پر بھی حملے کیے اور متعدد شہر آباد کیے۔ ۳۳۳ ق م میں عراق آکر فوت ہوا۔ اس کی عمر اس وقت ۳۳ سال تھی۔ یہ بادشاہ ظالم و جابر اور بُت پرست تھا۔

قرآن مجید نے ایک پُراسرار شخصیت ذوالقرنین[1] کا ذکر کیا ہے۔ مفسرین نے اِس کا

---

[1] قرن کے لغوی معنی سَو برس کی مدت، گیسو یا سینگ کے ہیں اس لیے ذوالقرنین سے مراد ہے دو سو (۲۰۰) برس حکومت کرنے والا یا دو گیسو یا دو سینگ والا۔ سکندر کو ذوالقرنین کہنے کی مختلف روایتیں ہیں ایک روایت یہ ہے کہ چونکہ یہ مملکت کا مالک رہا اس لیے ذوالقرنین کہلاتا ہے۔ ایک روایت وہب بن میبنہؒ کی یہ ہے کہ اس کے سر کے دونوں جانب دو سینگ غدود کی مانند اُبھرے تھے۔ حضرت خواجہ حسن بصریؒ کے نزدیک اس کی زلفیں دراز تھیں اور اُن کی دو چوٹیاں باندھا کرتا تھا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قول ہے کہ اُس کی دعوت توحید پر غضبناک ہو کر اُس کی قوم نے ایسی چوٹ لگائی تھی کہ اُس کے سر پر دو نشان پڑ گئے تھے۔ بعض لوگ اُس کے نجیب الطرفین ہونے پر اور والدین کی نجابت پر قرن سے تشبیہہ دیتے ہیں۔ کچھ لوگوں کے نزدیک اُس نے دو سو (۲۰۰) برس کی طویل عمر پائی اس لیے ذوالقرنین کہلایا۔ یا اُس نے زمین کی تاریکی اور روشنی کی سیاحت کی یا وہ علوم ظاہر و باطن دونوں کا حامل تھا اس لیے اِس نام سے مشہور ہوا۔

نام بھی سکندر قرار دیا ہے اور عام طور پر سکندر ذوالقرنین کے نام سے مشہور ہے۔ یہ سکندر سام بن نوح کی اولاد میں تھا اور عادل بادشاہ تھا۔ اس کے وزیر کا نام خضر تھا۔ آب حیات کی تلاش اس نے ہی کی تھی۔ قرآن مجید نے ذوالقرنین (سکندر) کے جو اوصاف بتائے ہیں اُن میں سے ایک تین تاریخی مہموں کا ذکر بھی ہے جو سکندر نے اپنی زندگی میں سر کی تھیں۔ پہلی مہم میں وہ مطلع شمس یعنی اُس مقام تک پہنچا تھا جہاں آبادیوں کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے اور سورج طلوع ہوتا معلوم ہوتا ہے۔ دوسری مہم میں وہ مغرب الشمس یعنی آفتاب کے غروب ہونے کے مقام تک گیا تھا۔ اُس کی تیسری مہم میں اُس کا واسطہ یاجوج ماجوج سے پڑا تھا جن کے فتنہ کو روکنے کے لیے اُس نے لوہے اور تانبے کی آمیزش سے ایک دیوار بنوائی تھی جو سدِ سکندری کے نام سے مشہور ہے۔ اس سد کو دیوار قہقہہ بھی کہتے ہیں۔ کچھ علماء ذوالقرنین کی نبوت کے بھی قائل ہیں۔ اُن میں مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم بھی متاخرین میں شامل ہیں۔ اس مسئلہ کے متعلق حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قول ہے کہ "ذوالقرنین نبی نہیں بلکہ عادل بادشاہ تھا۔ وہ فرشتہ نہیں بلکہ انسان تھا جس نے اللہ کو محبوب رکھا اور اللہ نے اُس کو محبوب رکھا۔"

مذکورہ بالا دونوں سکندروں میں تقریباً دو ہزار سال کا فرق ہے۔ دونوں کے اوصاف اتنے مختلف ہیں کہ سکندر رومی کو ذوالقرنین اور ذوالقرنین کو سکندر رومی قرار دینا سوائے مغالطہ کے اور کچھ نہیں ہے۔

لُقمانؑ

لقمان زمانۂ قدیم کی ایک عجیب و غریب شخصیت کا نام ہے جس کے تذکروں سے عرب کا

قدیم لٹریچر بھرا ہوا ہے۔ مجازاً دانا، عقیل اور تجربہ کار کو لقمان کہا جاتا ہے۔

عرب کی قدیم روایتوں میں لقمانؑ کا درجہ قومی ہیرو کا ہے۔ اُس کو دانشمند، کہن سال اور بوڑھے کی حیثیت سے ظاہر کیا گیا ہے۔ اُس کی عمر سات گِدھوں (نسر) کی عمر کے برابر طویل قرار دی جاتی ہے۔ اِس طرح اگر ایک گِدھ کی عمر اسّی سال مان لی جائے تو لقمان کی عمر کا اندازہ پانچ سو ساٹھ (۵۶۰) سال ہوا۔ بعض روایتوں میں تو اُس کی عمر ایک ہزار، دو ہزار اور تین ہزار سال تک بتائی گئی ہے۔ اُس کی بہادری اور دانشمندی کے بے شمار واقعات عرب کے لٹریچر میں شامل ہیں۔ قومی ہیرو کی حیثیت سے زانی کو سنگسار کرنے اور چور کے ہاتھ کاٹنے کی سزاؤں کا موجد اُسی کو مانا جاتا ہے۔ تاریخ قدیم کے مطابق لقمانؑ عادِ ثانیہ[1] کی نسل سے خالص عرب نژاد بادشاہ تھا۔

قرآن مجید کی سورۂ لقمان کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ ہو سکتا ہے کہ حکیم لقمانؑ اور لقمانؑ عاد ایک ہی شخصیت کے دو نام تھے۔ ابن کثیر کی رائے میں لقمان افریقی النسل تھا اور عرب میں غلام کی حیثیت سے آیا تھا۔ مولانا سلیمان ندویؒ نے ارض القرآن میں عرب میں رائج صحیفۂ لقمانؑ کو لقمانؑ عاد سے ہی منسوب کیا ہے۔ قرآن مجید سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ لقمانؑ عادِ ثانیہ کا نیک نفس بادشاہ اور حضرت ہودؑ کی اُمّت میں تھا۔ کچھ مفسرین نے اُس کو نبی بھی قرار دیا ہے لیکن یہ قول قرآن مجید کے اسلوب بیان سے مطابقت نہیں کرتا ہے۔ قرآن مجید میں اُس کے حکیمانہ نصائح اور بلیغانہ وصایا کا ذکر صراحت سے موجود ہے۔ جمہور مفسرین علماء کو اِس پر اتفاق ہے کہ لقمانؑ خدا کا نیک بندہ اور حکیم و دانا تھا لیکن نبی نہ تھا۔

مورخین اور افسانہ نگاروں کی روایتوں کے مطابق لقمان حضرت داؤدؑ کے زمانہ میں

---

[1] عادِ ثانیہ عرب کے قدیم قبیلہ یا اُمم سامیہ کے صاحب قوت و اقتدار افراد جماعت کا نام ہے جن کو قرآن مجید نے 'من بعد قوم نوح' کہہ کر قوم نوح کے خلفاء میں شمار کیا ہے۔

عہدۂ قضا پر مامور تھا یا وہ ایوبؑ کا بھانجہ تھا۔ توریت اور انجیل میں لقمان کو بلعم[1] قرار دیا ہے۔ یہ بھی مشہور ہے کہ اُس نے حکمت اور پیغمبری میں سے حکمت کا انتخاب کیا تھا۔ بہر حال یہ بات طے شدہ ہے کہ لقمان اپنے زمانہ کا بہت بڑا حکیم، مفکر، فلسفی، دانشور اور مصنف تھا۔ اُس کے علم و حکمت اور فہم و فراست کی کوئی نظیر نہ تھی۔

غالب ؎

تمام دہر میں اس کے مطب کا چرچا ہے
کسی کو یاد بھی لقمان کا نہیں ہے نام

راجہ اِندر کا اکھاڑا

راجہ اندر کا اکھاڑا کنایۃً ایسی صحبت یا مجلس کو کہتے ہیں جہاں پری جمالوں کا جمگھٹ ہو حسینوں کا ہجوم و اژدہام ہو۔ راجہ اندر کے دربار کو ڈرامہ کی صورت میں بھی دکھایا جاتا ہے، جس کو اندر سبھا کہتے ہیں۔ اُردو میں امانت لکھنوی کا اندر سبھا مشہور ہے۔

اِندر ایک پرانک دیوتا ہے جو برہما و وشنو اور شیو کے بعد سب دیوتاؤں سے افضل سمجھا جاتا ہے۔ اِس کو آسمان، بہشت، ہوا، بادل اور بہشتی حوروں کا مالک سمجھا جاتا ہے۔ اِس کو دیوراج بھی کہتے ہیں۔ ویدوں کی بہت سی رچنائیں اِس سے منسوب ہیں۔

---

[1] بلعم بنی اسرائیل کے ایک عالِم کا نام تھا۔ مثنوی مولانا روم کے مطابق اِس کو اسم اعظم یاد تھا۔ اِس نے حضرت موسیٰؑ کے دشمن سے ہمدردی کی تھی اس لیے حضرت موسیٰؑ کی دعا سے ذلیل و خوار ہوا۔ امام رازی کے قول کے مطابق بلعم پہلے دینِ حق پر تھا بعد کو گمراہ ہوگیا۔

دیوتا آندر کا رنگ کندن کی مانند سرخ، بازو لمبے اور شکل وصورت اختیاری ہے یعنی جو صورت چاہتے ہیں اختیار کر لیتے ہیں۔ اُن کا خاص ہتیار تجر ہے، کمان اور جال ہر وقت ساتھ رہتا ہے۔ موسموں کا انتظام، بارش کا اہتمام، برق و رعد کی ماموری اور زمینوں کو سرسبز و شاداب رکھنا اِن کے خاص کام ہیں۔ اُن کے خاص رتھ کا نام ویان اور دارالحکومت کا نام امراوتی ہے۔

غالب ؎ راجہ آندر کا جو اکھاڑہ ہے
ہے وہ بالائے سطحِ چرخِ بریں

آخری چہار شنبہ

ماہ صفر کا آخری چہار شنبہ مسلمانوں کا یوم مسرت ہے کیوں کہ آنحضرت صلعم نے اِس دن ایک طویل علالت کے بعد غسلِ صحت فرمایا تھا اور سبزے پر کچھ دیر چہل قدمی فرمائی تھی۔ مسلمانوں میں اُس دن سبزے کو روندنا، باغوں میں جانا اور چہل قدمی کرنا مستحسن سمجھا جاتا ہے۔ ایک روایت یہ ہے کہ آپؐ اِس دن علیل ہوئے تھے۔ اسی لیے مسلمانوں نے اُس دن دعا و استغفار اور صدقہ و خیرات کرنا شروع کیا اور باغون میں جاکر پند و وعظ کے جلسے کرنے لگے۔ امرا، خیر خیرات کے علاوہ اپنے عزیزوں اور متوسلوں کو سنہری اور روپہلی چھلے بھی تقسیم کیا کرتے تھے۔

آخری چہار شنبہ کے دن چھلّوں کی تقسیم کی رسم بادشاہ ظفر کے یہاں لال قلعہ میں

منائی جاتی تھی۔ بادشاہ مٹی کی ایک ہانڈی میں اشرفی ڈال کر، ہانڈی کو پاؤں سے توڑ کر، گھاس کو روندا بھی کرتے تھے۔ غالب ؎

ہے چار شنبہ آخرِ ماہِ صفر چلو
رکھ دیں چمن میں بھر کے مئے مشکبو کی ناند

جو آئے جام بھر کے پئے اور ہو کے مست
سبزے کو روندتا پھرے پھولوں کو جائے پھاند

غالب یہ کیا بیاں ہے بجز مدح شاہ کے
بھاتی نہیں ہے اب مجھے کوئی نوشت و خواند

بٹتے ہیں سونے روپے کے چھلّے حضور میں
ہے جن کے آگے سیم و زرِ مہر و ماہ، ماند

یوں سمجھیے کہ بیچ سے خالی کیے ہوئے
لاکھوں ہی آفتاب ہیں اور بیشمار چاند

فتنۂ محشر

فتنۂ محشر کنایتہً قیامت کے لیے کہا جاتا ہے جب آفتاب سوا نیزے پر ہوگا۔ نفسی نفسی کا عالم اور عجیب ہنگامہ کا دن ہوگا۔

غالب ؎
جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم
میں معتقد فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

قیامت کے معنی 'امرِ عجیب' کے ہیں۔ مذہبی اصطلاح میں اُس دن کو کہتے ہیں جب ساری بساطِ ہستی الٹ جائے گی، نظامِ کائنات درہم برہم ہو جائے گا اور لوگوں کو اُن کے اعمال کی جزا و سزا ملے گی۔ توراۃ، زبور اور انجیل میں اُس کو عدالت کا دن کہا گیا ہے۔ اہلِ ہند اس کو 'پرلے' کہتے ہیں۔

قیامت کا دن اگرچہ معیّن ہے لیکن اس کا علم سوائے خدا کے کسی کو نہیں۔ قرآن مجید اور احادیث نے اُس کو نزدیک سمجھنے کی کچھ علامتیں ضرور بیان کی ہیں اُن میں سے دس مخصوص اور قابل ذکر ہیں۔

(۱) آفتاب کا مغرب سے طلوع ہونا (۲) دخان یعنی دھواں (۳) دابۃ الارض (۴) یاجوج ماجوج کا خروج (۵) عیسیٰ بن مریم کا نزول (۶) دجّال کا خروج (۷) مشرق، مغرب اور عرب میں خسوف (۸) آگ کا قعر عدن سے نکلنا (۹) اُس آگ کا لوگوں کو سمیٹ کر لے جانا (۱۰) اور جب لوگ رات کو سو جائیں تو اُس آگ کا ٹھہر جانا اور اسی طرح دوپہر کے قیلولہ کے وقت بھی ٹھہری رہنا۔

قیامت کی تفصیل قرآن مجید کی سورۂ قمر، انعام، نحل، طٰہٰ، مردہ، قارعہ، انفطار، مرسلات، مومن، شعرا، بقر، مائدہ، فرقان اور نمل میں مذکور ہے اُس کا خلاصہ یہ ہے :-

"اُس دن صور (نرسنگھا) پھونکا جائے گا جس سے تمام عالم مر جائے گا اور اُس کی دوسری آواز سے لوگ پھر جی اٹھیں گے اور اور قبروں سے نکل آئیں گے۔ ہر ہر قوم کے لوگ جہاں کے پروردگار کے سامنے کھڑے ہوں گے۔ صور کی ندا ہوگی "لمن الملک الیوم" پھر اللہ تعالیٰ خود ہی جواب دے گا "للّٰہ الواحد القہار" پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح ہو جائیں گے۔ آسمان پھٹ جائے گا۔ ستارے بکھر جائیں گے۔ سمندر چلائے جائیں گے آفتاب اندھیرا کر دے گا اور ماہتاب بے نور ہو جائے گا۔ آفتاب اور ماہتاب دونوں اکٹھے کر دیے جائیں گے۔ (لوگوں کے ساتھ) اُن کے گواہ کھڑے ہوں گے۔ اُن کی زبانیں اُن کے خلاف گواہی دیں گی (اُس روز) نہ مال کام آئے گا اور نہ اولاد۔ آدمی

اپنے بھائی، ماں، باپ، بیٹوں سے بھاگے گا۔ کوئی کسی کا بدلہ نہ بن سکے گا (اُس دن) سچّوں کو اُن کی سچائی کام دے گی (اور) گنہگار اپنے دونوں ہاتھ چبائیں گے۔"

جاگیرِ سمندر

سمندر لفظ سام بمعنی آگ واندر کلمہ ظرف سے مرکب ہے۔ سمندر آگ کا ایک جانور ہے جو قد میں چوہے کے برابر اور صورت میں گرگٹ کی مانند ہوتا ہے۔ مشہور ہے کہ جہاں ایک ہزار سال تک متواتر آگ جلتی رہے تو اُس میں سمندر پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ آگ میں ہی رہتے ہیں۔ آگ سے باہر آکر مر جاتے ہیں۔ جاگیرِ سمندر سے مراد قدیم آتشکدہ ہے

غالب ؎
جاری تھی اسدؔ داغ جگر سے مری تحصیل
آتشکدہ جاگیرِ سمندر نہ ہوا تھا

ایران کے آتشکدوں میں اسلام سے قبل یہ جانور موجود تھے۔ لوگ اِس کی کھال کی ٹوپی بناتے تھے۔ جب وہ میلی ہو جاتی تھی تو آگ میں اُسے ڈال کر صاف کر لیتے تھے کیوں کہ اِس کی کھال پر آگ کا اثر نہیں ہوتا ہے۔ کچھ لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ عنقا کی مانند سمندر بھی محض افسانوی جانور ہے۔

زہرہ نوا

زہرہ ایک سیارہ کا نام ہے جس کو فارسی میں ناہید اور ہندی میں شکر کہتے ہیں۔ اس کے معنی روشن اور منوّر کے ہیں۔ قدیم مصر اور یونان کے لوگ اس سیارہ کی پرستش کرتے تھے اور اس کو محبت کی دیوی سمجھتے تھے۔ زہرہ کے متعلق مشہور ہے کہ یہ پہلے ایک حسین وجمیل مطربہ اور طوائف تھی اب سیارہ بن گئی ہے۔ اسی لیے اس کو رقاصۂ فلک بھی کہا جاتا ہے۔ رقص، نغمہ سرائی، خوش گلوئی اور ناز و انداز کے خصائص اکثر اس سے منسوب کیے جاتے ہیں۔ مرزا غالب کی ایک تلمیح میں زہرہ نوا سے مراد خوش الحانی ہے۔

غالب ؎ نغمۂ مطربانِ زہرہ نوا
جلوۂ لولیان ماہ جبیں

مشہور ہے کہ ایک بار دو فرشتوں ہاروت و ماروت نے انسانی گناہوں اور معصیتوں پر اللہ تعالیٰ کے حضور استہزا کیا تھا اور انسانوں پر فرشتوں کی فوقیت ظاہر کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں کو بغرض امتحان دنیا میں بھیجا کہ وہ انسانوں سے بہتر کردار دکھا سکیں۔ دونوں فرشتے دنیا میں آکر زہرہ اور مشتری نامی دو طوائفوں کے عشق میں مبتلا ہو گئے۔ زہرہ اور مشتری دونوں علم سفلی کی ماہر اور جادوگرنیاں تھیں۔ اُن دونوں نے فرشتوں کو اپنا علم سکھایا اور فرشتوں سے اسم اعظم سیکھا۔ دونوں فرشتوں نے اِن طوائفوں کو نہ صرف اسم اعظم سکھایا بلکہ بتوں کو سجدے کیے، چوری اور قتل انسانی جیسے جرائم میں مبتلا ہو گئے۔ طوائفوں کو اسم اعظم سکھا کر وہ خود اُس کو بھول بیٹھے۔ اسم اعظم کی برکت سے دونوں طوائفیں آسمان پر پہنچ کر سیارے بن گئیں اور ہاروت و ماروت غضب الٰہی کا شکار ہو کر بابل کے ایک کنوئیں میں قید کر دیے گئے۔ اُس کنوئیں میں وہ قیامت تک الٹے لٹکے رہیں گے۔ اُن کی

زبانیں شدّتِ تشنگی سے باہر نکلی رہتی ہیں اور جب بھی وہ پانی کی طرف مُنھ بڑھاتے ہیں تو پانی پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ اِس واقعہ سے متعلق چاہِ بابل، سحرِ بابل، جادوے بابل، ہاروت و ماروت، اسمِ اعظم، زہرہ و مشتری، رقاصہ فلک اور مطربہ فلک کی تلمیحات عام طور پر مستعمل ہیں۔ مشتری کو قاضی فلک کہا جاتا ہے۔

افلاطون

افلاطون یونان کے مشہور و معروف حکیم کا نام ہے جو سقراط کا شاگرد اور ارسطو کا استاد تھا۔ یہ اپنی دانشمندی، حکمت اور فلسفہ میں یونان کے مشہور حکماء میں شامل ہے، جن کی وجہ سے عقلِ یونانی کی شہرت ہوئی۔ کنایۃً فہم و ادراک رکھنے والے کو دانشور کہا جاتا ہے۔ سرکش اور زبردست کے معنوں میں بھی مستعمل ہے۔ ایسے موقعوں پر افلاطون کا سالا اور افلاطون کا نانی کہا جاتا ہے۔

افلاطون ۴۲۰ ق م کے لگ بھگ پیدا ہوا تھا۔ بیس ۲۰ سال کی عمر تک شعر و شاعری کی طرف متوجہ رہا۔ اس کے کئی دیوان موجود ہیں۔ پھر اُس نے علم حکمت اور فلسفہ سقراط سے حاصل کیا۔ سقراط کے مرنے کے بعد مقام اثینہ میں ایک درس گاہ قائم کر کے ساری زندگی درس و تدریس کا مشغلہ جاری رکھا۔ یہ حکیم اس درجہ خوش الحان اور شیریں بیان تھا کہ اِس کی مجلس میں عورتیں بھیس بدل کر شریک ہوتی تھیں۔ اُس کی سینکڑوں تصانیف میں سے 'فلسفیاتِ افلاطونہ' بے حد مشہور ہیں۔ ان میں پینتیس ۳۵ مباحث اور تیس ۳۰ مکتوبات شامل ہیں۔ یہ

مباحث مختلف فنون مثلاً طبعیات، سیاست، منطق اور علم تہذیب الاخلاق پر مشتمل ہیں۔ کہتے ہیں کہ ۷۸ سال کی عمر میں افلاطون ایک خم (مٹکے) میں بیٹھ گیا تھا۔ وہ مٹکا اس کی وصیت کے مطابق اس کے شاگردوں نے ایک پہاڑی غار میں منھ بند کر کے رکھ دیا تھا، اس طرح اُس کی موت ہوئی۔ اس واقعہ کے لیے خم افلاطون کی تلمیح مستعمل ہے۔

غالب ؎ کہ بحثِ علم میں اطفال ابجدی اس کے
ہزار بار فلاطوں کو دے چکے الزام

گلستانِ ارم

گلستانِ ارم شدّاد کی بنائی ہوئی جنتِ ارضی کا نام ہے۔ اِس کو بہشتِ شدّاد، بہشتِ اِرم، باغِ ارم یا صرف اِرم بھی کہا جاتا ہے۔ شدّاد عرب عاربہ کے گروہ سے عاد بن عوص کا بیٹا اور سام بن نوح کی نسل سے تھا۔ اِس کی عمر نو سو برس کی بتائی جاتی ہے۔ اِس بادشاہ نے جنّت کی صفات سُن کر نواحی شام کے نخلستانوں میں ارم نام کا ایک شہر بسایا تھا اور اِس کام میں ضحاک سے بھی مدد لی تھی جو اُس زمانہ میں تختِ جمشید (ایران) پر قابض تھا۔ اس شہر میں سونے اور چاندی کا استعمال عمارتوں کی تعمیر میں کیا گیا تھا۔ یاقوت، زبرجد، بلّور اور دوسرے قیمتی پتھروں کی پچی کاری کی گئی تھی۔ زمین پر خاک کی جگہ عنبر اور زعفران بچھایا گیا تھا۔ نہروں میں ریگ کے بدلے آبدار موتی صاف و شفاف پانی میں ڈالے گئے تھے۔ تازہ دودھ، شہد اور شراب کی نہریں علحدہ جاری تھیں جن کی خوشنما روشوں پر جواہرات کے درخت تھے

اور اُن کے خوشنما مصنوعی پھولوں میں خوشبو کے لیے مشک وعنبر رکھا گیا تھا۔ اسی طرح حسین ترین لڑکیاں اور نوخیز لڑکے حور و غلماں کے طور پر اِس جنّت میں داخل کیے گئے تھے۔ یہ شہر تین سو برس میں تیار ہوا تھا لیکن شدّاد اُس کو خود نہ دیکھ سکا جب کام مکمّل ہوگیا تو بہشت کے دروازہ پر ہی اُس کی روح قبض کرلی گئی تھی۔

غالبؔ ؎
حیرت، حدِ اقلیم تمنائے پری ہے
آئینے پہ آئینِ گلستانِ ارم باندھ

اِس بہشت کے متعلق یہ بھی مشہور ہے کہ اب نظروں سے اوجھل ہے یا اللہ تعالیٰ نے اُس کو آسمان پر آٹھویں بہشت یا اعراف بنالیا ہے۔

اس کے بارے میں مفسرین اور محققین کی روایتوں میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں تو صرف اتنا مذکور ہے " الم تر کیف فعل ربک بعاد ارم ذات العماد التی لم یخلق مثلھا فی البلاد"۔ یعنی " رب نے عاد کے ساتھ جو کہ اولادِ ارم سے تھا کیا کیا اور وہ (اولادِ ارم) کتنی قدآور تھی کہ مثل اُس کے (لوگ) شہروں میں پیدا نہیں کیے گئے"۔ بعض مفسرین نے ارم بن عوص (شدّاد) کے نام کو کسی شہر یا مقام سمجھ کر ایک جنت ارضی منسوب کردی ہے۔ علامہ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ " نہ صحرائے عدن میں کوئی ایسا شہر ہے اور نہ لوگوں نے کوئی ایسی جنّت بنائی تھی۔ یہ سب ضعیف روایتیں ہیں"۔ یہ ممکن ہے کہ ارم نے اپنے نام پر کوئی باغ بنایا ہو اور وہ خاص شہرت رکھتا ہو لیکن ایسے بہشت کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ملتا ہے۔ اِس کے نام اور مقام میں بھی اختلاف ہے۔ کوئی اس کو صحرائے عدن میں بتاتا ہے اور کسی کے نزدیک یہ مقام اسکندریہ یا دمشق میں تھا۔

امام فخرالدین رازی نے ایک روایت نقل کی ہے کہ ایک بار امیر معاویہؓ بن سفیان کے عہد میں عبداللہ بن قلابہؓ اپنا اونٹ تلاش کرتے ہوئے ایک ایسے شہر میں جا پہنچے تھے جہاں ہر طرف زرد جواہر کا انبار تھا۔ وہ جتنے جواہرات اٹھا سکتے تھے اپنی جھولی میں بھر کر

لے آئے تھے۔ جب یہ واقعہ کعب احبار انصاریؓ کے سامنے پیش ہوا تو انہوں نے تصدیق کی کہ یہ شہر "ذات العماد" تھا۔ اُس کے بعد انہوں نے اِس شہر کے متعلق ایک حدیث سنائی۔ اُس کے بعد حضرت امیر معاویہؓ نے شہر ذاتِ العماد کی بہت تلاش کرائی لیکن کوئی کامیابی نہ ہو سکی۔

ان روایتوں کے اختلاف کو دیکھتے ہوئے باغِ ارم کے متعلق کوئی فیصلہ کرنا دشوار ہے۔

ہنوز دِلّی دُور ہے

یہ تلمیحی ضرب المثل ایسے موقعوں پر بولتے ہیں جب حصولِ مطلب میں دیر ہو یا بہت سا کام باقی رہ گیا ہو۔

اِس کا واقعہ تاریخ فرشتہ میں مذکور ہے کہ غیاث الدین بلبن بباطن حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ سے کاوش اور عداوت رکھتا تھا۔ اُس نے بنگال سے دلّی کو مراجعت کرتے ہوئے حضرتؒ سے کہلوایا تھا کہ "میرے دلّی پہنچنے سے قبل آپ دلّی چھوڑ دیں اور اپنے مسکن غیاث پور سے بھی ہاتھ اٹھائیں۔" قاصد سے پیغام سُن کر حضرت محبوب الٰہیؒ نے فرمایا تھا "بابا ہنوز دلّی دور است" ابن بطوطہ نے اِس روایت کو اس طرح بیان کیا ہے کہ غیاث الدین کا لڑکا جونا خاں اپنی مرضی کے خلاف سرکارِ محبوب الٰہیؒ کا ارادت مند اور حاضر باش تھا۔ ایک دن حالتِ وجد میں حضرتؒ نے اُس سے کہا "جا ہم نے تجھے

سلطنت بخش دی۔" یہ خبر جب غیاث الدین کے کانوں میں پہنچی تو اُس کو بہت ناگوار ہوا اور اُس نے بنگال سے پیغام بھیجا کہ "یا شیخ آں جا باشد یا من"۔ اِس بات کو سن کر حضرت نے مذکورہ بالا جملہ زبان مبارک سے ارشاد فرمایا تھا۔ پھر ایسا ہی ہوا کہ غیاث الدین کے لیے دِلّی دُور ہی رہی اور وہ افغان پور میں ہی قصر تغلق میں دب کر مر گیا۔

غالب ؎
کیجے، جوں اشک اور قطرہ زنی
اے اسدؔ، ہے ہنوز دلّی دور

قیصر روم

قیصر لاطینی زبان میں ایسے بچّہ کو کہتے ہیں کہ جو ماں کے مرنے کے بعد شکم چیر کر نکالا گیا ہو۔ روم کا پہلا بادشاہ اغسطوس اسی طرح پیدا ہوا تھا اس لیے قیصر کے نام سے مشہور ہوا اس کے بعد روم کے بادشاہوں کا یہ لقب ہو گیا جیسے مصر کے بادشاہوں کا فرعون اور چین کے بادشاہوں کا فغفور ہے۔ اُردو شعرا نے قیصر روم کو جب بھی استعمال کیا ہے تو اُس سے نغفور (نائی سی فورس)، سے مُراد لی جاتی ہے۔ ۱۸۷ھ ہجری میں اِس بادشاہ نے خلیفہ بغداد ہارون رشید کو خط لکھ کر باج گزاری سے انحراف کیا تھا۔ اُس کے جواب میں ہارون رشید نے فریجیا کے مقام پر قیصر روم کو ایسی زبردست شکست دی کہ وہ سلطنت ہی صفحہ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹ گئی۔

غالب ؎
جاں نثاروں میں تیرے قیصر روم
جرعہ خواروں میں تیرے مرشدِ جام

اِس شعر میں مرشدِ جام سے مراد ایران کے مشہور صوفی بزرگ شیخ الاسلام احمد جام ژندہ پیل (متوفی ۵۳۶ھ ہجری) سے ہو سکتی ہے۔

زم زم اور طوفِ حرم

زم زم بیت اللہ کے ایک مخصوص کنوئیں کا پانی ہے۔ مسلمان اس پانی کو طاہر اور متبرک سمجھتے ہیں۔ ایک حدیث کے مطابق یہ پانی کُل امراض کے لیے شفا کا حکم رکھتا ہے اور غذا کا کام بھی دیتا ہے۔ مرتے وقت اِس کو مُنھ میں ٹپکانا باعث تسہیل جاں کنی سمجھا جاتا ہے۔ طوفِ حرم سے مراد طوافِ کعبہ سے ہے جو ہر سال ۱۰ ذی الحجہ کو مناسک حج کے دوران کیا جاتا ہے۔ حرم کے لغوی معنی ممنوع، مقدس اور متبرک کے ہیں۔ اسی لیے حجاز مقدس کے دو شہروں مکہ اور مدینہ کو "الحرمین" کہا جاتا ہے۔ کعبہ یعنی بیت اللہ کے اِرد گرد احاطہ بنا کر طواف کے لیے جو حد مقرر کی گئی ہے اس کو بھی حرم کہا جاتا ہے کیوں کہ متبرک اور مقدس ہونے کے ساتھ وہاں پر خون بہانا بھی ممنوع ہے۔

غالب ؎

زم زم پہ ہی چھوڑو مجھے کیا طوافِ حرم سے
آلودہ بہ مے جامہ احرام بہت ہے

زم زم کے متعلق قرآن مجید میں پوری تفصیل دی ہوئی ہے۔ اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اپنی پہلی بیوی سائرہؓ کے اصرار پر دوسری بیوی ہاجرہؓ اور شیر خوار بچہ اسمٰعیلؑ کو وادی غیر ذی زرع میں چھوڑ آئے تھے۔ جب ساتھ آیا ہوا پانی ختم ہو گیا تو معصوم بچہ شدت تشنگی سے

تڑپنے لگا بی بی ہاجرہؓ پانی کی تلاش میں اِس وادی بے آب وگیاہ میں دوڑنے لگیں اور انہوں نے سات پھیرے صفا و مروہ پہاڑیوں کے کیے۔ یہی مقام "سعی بین الصفا المروہ" ہے جس کو لوگ حج میں کرتے ہیں۔ آخری بار جب وہ مروہ پہاڑی پر تھیں تو انہوں نے جبرئیلؑ کی آواز سنی۔ بی بی ہاجرہؓ کی درخواست پر جبرئیل اُن کے سامنے آگئے اور انہوں نے اپنی ایڑی یا پَر مار کر زمین کے اُس حصہ کو چاک کر دیا اسی وقت وہاں سے پانی جاری ہوگیا۔ بی بی ہاجرہؓ نے جب پانی کو اُبلتے ہوئے دیکھا تو بے حد خوش ہوئیں اور فوراً ہی پانی پر باڑھ بنا کر کہنے لگیں "زم زم" یعنی "رک جا رک جا" اسی وقت سے اِس چشمہ کا نام "زم زم" ہوگیا ہے۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا تھا کہ "اللہ تعالیٰ اُم اسمٰعیلؓ پر رحم کرے اگر وہ زم زم کو اس طرح نہ روکتیں اور باڑھ نہ لگاتیں تو آج وہ چشمۂ عظیم ہوتا۔"

غالب ؎ رات پی زمزم پہ مے اور صبحدم
دھوئے دھبے جامۂ احرام کے

دونوں اشعار میں جامہ احرام سے بغیر سِلے ہوئے کپڑوں یعنی تہمد اور چادر سے مراد ہے جو کہ حج کے دوران پہنا جاتا ہے۔ مناسک حج میں کچھ چیزیں چند روز پیشتر سے ہی ممنوع ہو جاتی ہیں اُن میں سِلے ہوئے کپڑوں کا پہننا بھی شامل ہے۔

حُور

حُور جمع ہے حوراکی۔ اِس کے لغوی معنی ہیں گوری چٹی عورت جس کی آنکھ کی پُتلی اور

بال بہت سیاہ ہوں۔ (فارسی اور اُردو میں مفرد کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جیسے جواہر یا احرام) کنایتہً پری جمال اور شکیل و جمیل عورت کو بھی کہا جاتا ہے۔

بہشت کی عورتوں کو حُور کہا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں ان کے مختلف خصائص پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ سورۂ بقرا اور آل عمران میں اِن کو "ازواج مطہرہ" (جسمانی پاکی اور کردار کی بلندی سے مُراد) سورۂ رحمٰن میں "قصرات الطرف" (نیچی نگاہ والیاں) اور اسی سورہ میں ایک جگہ "مقصورات فی الخیام" (خیموں میں رہنے والیاں) کہا گیا ہے۔

مفسرین نے ان حوروں کے متعدد خصائص بیان کیے ہیں۔ یعنی اِن کی خلقت مشک و عنبر سے ہوئی ہے۔ اِن کا جسم صاف و شفاف ہے۔ ان کے مُنہ سے گلاب کی خوشبو آتی ہے وغیرہ وغیرہ۔

نیک اور پرہیزگار لوگ جب جنت میں جائیں گے تو اُن کی پیشوائی یہ حوریں کریں گی جو کنواری اور اپنے شوہروں کی ہمعمر ہوں گی (سورۂ واقعہ)

غالب ؎ میں جو کہتا ہوں کہ ہم لیں گے قیامت میں تمہیں
کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم حور نہیں

(قیامت کی تفصیل "فتنۂ محشر" کی تلمیح میں دیکھیے)

اِشاریہ

۱۔ تلمیحات

الف مقصورہ

الف ممدودہ

خ

د

ذ

ر

ز

۲۔ عام الفاظ

۳۔ شہر و مقامات، دریا و پہاڑ

۴۔ شخصیات

غلط نامۂ تلمیحاتِ غالب

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۸	۲۰	جرِ ثقیل	جَرِّ ثقیل
۲۰	۱۳	ی دیوار	تیسری دیوار
۲۴	۴	دام لیتے ہیں (واو کی جگہ دال غلط ہے)	وام لیتے ہیں
۲۵	۲۱	جلہ	جگہ
۳۵	۱۳	جب لوگوں	جب اِن لوگوں
۳۷	۱۳	تیمار دار	بیمار دار
۳۸	۲	ناتوانی میں	ناتوانی سے
۳۹	۲۰	کادِ کاوِ	کاو کاوِ
۴۲	۱	کعبہ	کعبے

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۴۶	۱	خیال یار ہے باقی	خیال یار باقی ہے
۴۸	۳	منفتاح	منفتاح
۴۸	۹	ختم کر چکا	ختم ہو چکا
۴۹	۱۳	لنسر	نسر
۵۱	۵	دشت عجز	دستِ عجز
۵۴	۹	آبی پیراہن ہر موج رود نیل کا	آبی پیرہن ہر موج رود نیل کی
۵۵	۱۰	ہر شب صورِ اسرافیل کی	ہر شب، صور، اسرافیل کی
۶۶	۲،۷،۸	نبات النعش	بناتُ النعش
۶۶	۲	اور اس کی جمع	اور بنت النعش کی جمع
۶۹	۶	ترنج	ترنج
۷۳	۱۳	خبت الحذ	خبت الخلد
۷۴	۱۴	پر ملائکۃ اللہ	اس پر ملائکۃ اللہ
۸۳	۱۱	حقیقت میں دریا	حقیقت میں ہے دریا
۸۵	۱	ہی منشی	ہخا منشی
۸۹	۱۶	چونکہ یہ مملکت	چونکہ یہ ۲ دو مملکت
۹۰	۳-۴	ان میں (سے ایک) تین	ان میں تین

9